تعلیم
عہد اسلامی کے ہندوستان میں

ظفر الاسلام اصلاحی

دار المصنفین، شبلی اکیڈمی
اعظم گڑھ۔ ۲۷۶۰۰۱ یو۔ پی (ہند)

Marfat.com

تعلیم عہدِ اسلامی کے ہندوستان میں

ظفر الاسلام اصلاحی

پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ ۲۷۶۰۰۱

یو۔ پی (ہند)

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ

سلسلۂ دارالمصنفین نمبر۔ ۱۹۵

134735

نام کتاب	:	تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں
مصنف	:	ظفر الاسلام اصلاحی
ناشر	:	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (یو۔ پی)
باہتمام	:	عبدالمنان ہلالی
مطبع	:	ڈائمنڈ پرنٹرز، نئی دہلی - 9811126868
سن اشاعت	:	۲۰۰۷ء
صفحات	:	۱۴۴
قیمت	:	۱۰۰/روپے (Rs.100/-)

Talim Ahd-e- Islami ke Hindustan mein

Author : Zafarul Islam Islahi
Publisher : Darul Musannefin, Shibli Academy
Azamgarh - 276001 (U.P)
Ph. No. 05462 - 265017

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

	دیباچہ	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	۵
	تعارفی کلمات		۹
باب اول	عہدِ سلطنت کے مدارس—ایک جائزہ		۱۸
باب دوم	عہد اسلامی کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے ذرائع		۴۴
باب سوم	عہدِ اسلامی کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی درسیات		۷۴
باب چہارم	تعلیمِ نسواں عہدِ اسلامی کے ہندوستان میں		۹۱
باب پنجم	مدارس کے قیام اور علم کی اشاعت میں خواتین کی دلچسپیاں		۱۱۸
	کتابیات		۱۳۵

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"وقل رب زدنی علما"

(طٰہٰ/۱۱۴)

[اور دعا کر و اے میرے رب مجھے مزید علم عطا کر]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

الحمدللہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ الکریم محمد الامین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

ہندوستان کے مسلم دور کی جو تاریخیں انگریزوں کے عہد حکومت میں لکھی گئیں، ان میں جان بوجھ کر اس دور کی ایسی قبیح اور بدنما تصویر پیش کی گئی ہے جس سے خود مسلمانوں کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے گھن آنے لگتی ہے اور ان کے ہم وطنوں کے دلوں میں مسلم سلاطین اور عام مسلمانوں سے نفرت وعناد کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں، انگریز مورخین ہندوستان سے مسلمانوں کے تعلق کا آغاز محمود غزنوی کے حملوں یا محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے کرتے ہیں، اس سے ان کا مقصد یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق حملہ آوروں اور فاتحوں کا ہے، انھوں نے اپنے اس جھوٹے دعوے کو مسلسل اور بار بار اتنا دہرایا کہ اسے ایک مسلم الثبوت واقعہ بنا دیا حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ ان فتوحات سے بھی پہلے ہندوستان سے مسلمانوں کے گوناگوں علمی، مذہبی، ثقافتی اور تجارتی تعلقات قائم ہو گئے تھے، بلکہ ہندوستان سے عربوں کے تعلقات کی ابتدا آنحضرت ﷺ کی بعثت سے بھی بہت پہلے ہو چکی تھی۔ عرب تجارت پیشہ تھے اور اسی حیثیت سے یہاں آ کر ساحلی علاقوں میں جہاں بندرگاہیں تھیں آباد ہو گئے تھے اور یہاں کے ہندوؤں سے ان کے تعلقات بڑے خوش گوار تھے اور ہندو راجہ بھی ان کی بڑی قدر و عزت کرتے تھے۔

بعد میں جب فاتح کی حیثیت سے بھی اس ملک میں مسلمان آئے تو انھوں نے اجنبی حکمرانوں کی طرح اسے تجارت کی منڈی سمجھ کر اس کی دولت نہیں سمیٹی بلکہ اس کو اپنا وطن بنا کر یہیں بود و باش اختیار کر لی اور مرنے کے بعد اسی کی خاک کا پیوند ہو گئے۔ حقیقت یہ کہ مسلمان شروع سے ملک کی تعمیر و ترقی، اس کو بنانے سنوارنے اور باغ و چمن سے آراستہ کرنے میں مصروف رہے، انھوں نے حکومت و سیاست، علم و فن، صنعت و حرفت، تجارت و معیشت اور زراعت اور باغبانی کو فروغ دے کر جانوروں اور پرندوں کی افزائش

نسل اور سیکڑوں رفاہ عام کے کام کر کے اسے جنت نشاں بنا دیا، ملک کو ایک شاندار تمدن اور ترقی یافتہ تہذیب دی جس کے جلووں سے صدیوں تک ہندوستان جگمگاتا اور چمکتا رہا اور آج بھی اسی سے یہاں کی تہذیب و معاشرت کے سارے گوشے پرنور اور درخشاں ہیں۔

لیکن اس زمانے میں تاریخ نویسی کا مذاق ایسا تھا کہ مؤرخین اپنا زور قلم سلاطین کی فتوحات اور کشورکشائی کی داستان سرائی میں زیادہ صرف کرتے تھے اور علم و تعلیم اور شعر و ادب کے حالات کی جانب کم توجہ مبذول کرتے تھے، کیونکہ ان پر ایرانی نظریہ تاریخ چھایا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس دور کی تاریخیں محاربات اور سیاسی واقعات سے بھری ہوئی ہیں اور ان کو بڑی مقبولیت اس لئے حاصل ہوئی کہ عام لوگوں کو میدان کارزار کے حالات اور معرکہ آرائیوں کے قصے اور مبالغہ آمیز واقعات سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ حالانکہ اس دور کے مسلم فرماں روا صرف تیغ وسناں کے دھنی ہی نہیں تھے بلکہ علم و ادب نواز بھی تھے اور وہ خود اور ان کے امراء و وزراء علم دوستی اور معارف پروری کے لئے مشہور تھے اور اُن کی سرپرستی میں گوناگوں علمی، تعلیمی اور ادبی کام بھی انجام پاتے تھے، ان کے اس طرح کے کارناموں سے خود اس دور کی تاریخیں بھی یکسر خالی نہیں ہیں، لیکن ان کے نقوش بہت دھندلے اور اس قدر غیر مرتب اور منتشر ہیں کہ مسلم حکمرانوں کی زندگی کا یہ رخ عام طور سے نظروں سے اوجھل رہا، اب ضرورت ہے کہ ان مٹے ہوئے نقوش کو بھی ابھارا جائے اور علم و ادب نوازی اور درس و تعلیم کی سرپرستی میں سلاطین کی خدمات اور اس دور کے علماء، ادبا اور شعراء کے حالات و واقعات کو جو متفرق اوراق میں بکھرے ہوئے ہیں یکجا کر کے نمایاں کیا جائے تاکہ ان کی علمی و ادبی، تعلیمی و تدریسی، فلاحی و تعمیری اور معاشرتی و تمدنی کارناموں کا مرقع بھی سامنے آ جائے۔ اس نوع کی کچھ کتابیں پہلے دارالمصنفین سے شائع ہو چکی ہیں۔

اس وقت ناظرین کے ہاتھوں میں جو کتاب ہے اس میں بڑے استیعاب واستقصا سے کام لیا گیا ہے۔ اور ہندوستان کے مسلم دور میں علم و تعلیم کی گرم بازاری، درس و تدریس کی سرگرمی اور مدارس اور درسگاہوں کی نوعیت و کیفیت بیان کی گئی ہے اور معاصر مآخذ کے علاوہ بعد کی کتابوں میں موضوع سے متعلق جو منتشر اور پراگندہ مواد مل سکا ہے

Marfat.com

انھیں بڑی خوبی اور نہایت سلیقے سے اس طرح اکٹھا کر دیا گیا ہے جس طرح کوئی دہقان دانہ دانہ جمع کر کے خرمن تیار کرتا ہے یا چڑیا تنکے تنکے چن چن کر کے اپنا نشیمن بناتی ہیں۔

مصنف عرصے سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں، ان کا تعلق تاریخ اور اسلامک اسٹڈیز دونوں شعبوں سے رہا ہے، اسلامی علوم اور ہندوستان کے مسلم دور کی علمی و ثقافتی تاریخ ان کا اختصاصی مضمون ہے۔ خصوصاً عہد سلطنت میں اسلامی شرائع و قوانین کے نفاذ و ترویج اور فقہ و افتا سے متعلق جو بہتم بالشان کام انجام پائے ہیں ان پر ان کی گہری اور وسیع نظر ہے اور اس عہد کا اس حیثیت سے انھوں نے بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے، اس کا ثبوت اُردو و انگریزی زبانوں میں ان کی یہ تصانیف ہیں جو اس سے پہلے شائع ہو چکی ہیں۔

☆ اسلامی قوانین کی ترویج و تنفیذ۔ عہد فیروز شاہی کے ہندوستان میں

☆ سلاطین دہلی اور شریعت اسلامیہ

☆ Socio-Economic Dimension of Fiqh Literature in Medieval India

☆ Fatawa Literature of th Sultanate Period

زیر نظر کتاب میں انھوں نے ہندوستان میں مسلم دور حکومت کی تعلیمی سرگرمیوں پر بڑی کدو کاوش سے بحث کی ہے اور اس کی نمایاں خصوصیات و امتیازات بھی دکھائی ہیں، یہ دراصل ان کے پانچ مضامین کا مجموعہ ہے جو گرچہ الگ الگ اور مختلف وقتوں میں لکھے گئے ہیں لیکن ہار کے موتیوں کی طرح ایک ہی لڑی سے منسلک ہیں۔

کتاب کے پہلے باب میں عہد سلطنت کے مدارس کا جائزہ لیا گیا ہے جس سے اس دور کے مدارس کی نوعیت اور ان کی خدمات کا مفصل خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے باب میں مسلم دور حکومت میں اعلیٰ مرحلہ میں تعلیم دینے اور دلانے کے لئے جو وسائل و ذرائع اختیار کئے جاتے تھے اور درس و تدریس میں جو کتب داخل درس اور جزو نصاب تھیں ان پر بڑی پر مغز اور معنی خیز بحث کی گئی ہے اور کوئی جزئی بات بھی چھوٹنے نہیں پائی ہے۔

اسلام میں جس طرح مردوں کے لئے علم کی تحصیل ضروری قرار دی گئی ہے اسی

Marfat.com

طرح یہ عورتوں کے لئے بھی لابد ہے جس کا التزام ہندوستان کے مسلم دور حکومت میں بھی کیا گیا تھا۔ مصنف نے چوتھے باب میں اس دور میں تعلیم نسواں کا حال بیان کیا ہے اور آخری باب میں مدارس کے قیام اور علم کی توسیع واشاعت میں خواتین کی دلچسپیوں اور کوششوں کا جائزہ لیا ہے۔

یہ مفید موضوع دلچسپ اور عصری اہمیت کا حامل ہونے کی بنا پر مصنف کے غور وفکر اور محنت ومطالعہ کا خاص مرکز رہا ہے، ان کی تلاش وتحقیق اور سنجیدہ ومتین انداز بیان نے کتاب کو بھاری بھرکم اور باوزن بنا دیا ہے، امید ہے کہ علمی ودینی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی، مجھے اس کی خوشی ہے کہ مصنف نے بہ طیب خاطر اسے دارالمصنفین کے سلسلۂ مطبوعات میں شامل کرنے کے لئے پیش کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے اور علم وعمل دونوں خوبیوں سے مزید آراستہ کرے۔ آمین

خاکسار

ضیاء الدین اصلاحی
دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
اعظم گڑھ

۲۱ر صفر المظفر ۱۴۲۸ھ
۱۱ر مارچ ۲۰۰۷ء

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارفی کلمات

اسلام اور علم میں جو گہرا تعلق ہے وہ محتاجِ وضاحت نہیں۔ دراصل اسلام کی ابتدا ہی علم اور معرفت سے ہوتی ہے یعنی انسان کا اپنے خالق و مالک حقیقی کو پہچاننا اور اس کا صحیح علم حاصل کرنا۔ درحقیقت یہی بنیادی علم اہل اسلام کے علم کی بنیاد بن جاتا ہے اور اسکا رشتہ علم عطا کرنے والے سے جوڑ دیتا ہے اور اسے علم نافع کے اکتساب پر آمادہ کرتا ہے۔ اسی بنیادی علم کے وجہ سے اہل اسلام کا یہ مزاج بن جاتا ہے کہ وہ علم کے جس میدان میں بھی قدم رکھتے ہیں وہ اس کے منبع کو یاد رکھتے ہیں اور علمی زندگی کے ہر موڑ پر اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ بلاشبہ علم کی طلب مومن کا خاصہ ہے اور اسکی اشاعت کے لئے جدوجہد کرنا اہل اسلام کی اہم مصروفیات میں سے ہے۔ ان امتیازات سے اسلام کا کوئی دور خالی نہیں رہا ہے۔ مختلف ادوار کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مسلمان دنیا کے جس خطہ میں بھی سکونت پذیر ہے یا جہاں کہیں ان کی حکومت قائم ہوئی تو مسجد کی تعمیر، تعلیمی نظام کے اجراء اور علم کی اشاعت کو انہوں نے ضروری سمجھا۔ یہ سلسلہ اصلاً مسجد و مکتب سے شروع ہوتا اور مدارس و تعلیم کے انفرادی مراکز کی صورت میں برگ و بار لاتا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد، ان کی آبادکاری اور حکومت کی تاریخ میں اس نوع کی مثالیں بہ کثرت دستیاب ہیں۔ یہ بات بخوبی معروف ہے کہ اس سرزمین میں مسلمانوں کے تعلیمی نظام کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب ساتویں صدی عیسوی کے آخر میں جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں بالخصوص مالابار میں عرب تجار نے اپنی نوآبادیات قائم کیں اور اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ رہائش اختیار کی۔ آٹھویں صدی عیسوی کی ابتداء میں سندھ میں عربوں کی حکومت کے قیام کے بعد یہ سلسلہ اور آگے بڑھا۔ اس کے تقریباً پانچ سو برس بعد جب شمالی ہندوستان میں دہلی سلطنت قائم ہوئی تو اس تعلیمی نظام کی توسیع و ترقی کے بھرپور مواقع

Marfat.com

فراہم ہوئے۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کی مذہبی و معاشرتی ضروریات، سلاطین دہلی کی معارف پروری اور علماء کی دلچسپی بھی اس نظام کو مستحکم بنانے میں بہت اہم کردار رہا ہے۔ مغل بادشاہوں کے عہد میں مسلم حکومت کے حدود اور وسیع ہوئے اور وسائل حکومت میں بھی اضافہ ہوا، اس دور میں علمی اور تمدنی سرگرمیاں بڑھیں اور قدیم مدارس کی توسیع و ترقی کے ساتھ بہت سے نئے مدارس (بالخصوص گجرات اور دوسرے نئے مفتوحہ علاقوں میں) وجود میں آئے۔ مزید براں اس دور میں ہندوستان کے عرب و دیگر اسلامی ممالک سے روابط اور مستحکم ہوئے۔ اس کی بدولت بیرونی علماء کی ہندوستان آمد اور علماء ہند کے بیرونی سفر میں مزید آسانیاں فراہم ہوئیں اور ایک دوسرے سے استفادہ اور کتابوں کے تبادلے کے بہتر مواقع میسر ہوئے۔ ان سب کے علاوہ مغل دور میں ایران سے تعلقات کی مضبوطی کے ساتھ علماء معقولات کی آمدورفت میں اضافہ ہوا اور علوم عقلیہ کی کتابیں بکثرت یہاں مہیا ہوئیں۔ اس کے اثرات اس وقت کے تعلیمی نظام پر بھی پڑے، خاص طور سے بدلے ہوئے علمی ماحول میں معقولات کی تعلیم کا سلسلہ کچھ مزید آگے بڑھا اور نصاب تعلیم میں نئے رجحانات سامنے آئے۔ عہد اسلامی کے ہندوستان میں تعلیم کے موضوع سے بحث کرتے ہوئے ان سب امور پر غور و فکر اور ان کا گہرا مطالعہ و تجزیہ اہمیت و افادیت سے خالی نہ ہوگا۔

درحقیقت زیر بحث موضوع بڑی وسعت رکھتا ہے اور مختلف پہلوؤں سے اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور ہر پہلو سے یہ اہمیت رکھتا ہے، اس لئے کہ اس دور کا تعلیمی نظام اس ملک میں مسلمانوں کی سماجی و تمدنی زندگی کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ بہت پہلے سے اس موضوع پر اظہار خیال کا سلسلہ جاری ہے اور مختلف زبانوں میں اس سے متعلق کتب و مضامین دستیاب ہیں، لیکن یہ بھی ایک اہم حقیقت ہے کہ یہ مسئلہ جتنا اہم ہے اور جس دلچسپی و توجہ سے اصحاب علم و اہل قلم میں موضوع بحث بنا ہے اسی قدر یہ بہت سی غلط فہمیوں اور غلط تاثرات سے گھر ا ہوا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض اعتبار سے یہ مسئلہ عہد وسطیٰ ہی سے غلط فہمی کا شکار رہا ہے۔ یہ بات بخوبی معروف ہے کہ دہلی سلطنت ۱۲۰۶ء میں قائم ہوئی اور ہندوستان میں مدارس کے قیام

Marfat.com

کا سلسلہ اس سے پہلے سے جاری ہے۔خود سلاطین دہلی کے زمانہ میں کثیر تعداد میں مدرسے اس شہر میں وجود میں آئے جن میں بعض بڑے بڑے اقامتی ادارے تھے لیکن ان سب کے باوجود اس کے تقریباً تین سو برس بعد جب اولین مغل بادشاہ بابر نے ۱۵۳۰ء میں تزک بابری کی تالیف مکمل کی تو اس میں یہ تاثر ظاہر کیا کہ ہندوستان میں ''نہ حمام ہے اور نہ مدرسہ'' (بابرنامہ، چترا پربھا پریس، بمبئی، ۱۳۰۸ھ، ص ۲۰۴) دوسری جانب مشہور فرانسیسی سیاح برنیر (Bernier) شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور ۱۶۵۶ء تا ۱۶۶۸ء یہاں مقیم رہے۔واپسی پر اپنے سفرنامہ مرتب کرتے وقت انہوں نے یہاں کے بارے میں اپنے مشاہدات و تجربات بہت تفصیل سے درج کیے۔اس ملک کے سماجی حالات کی عکاسی کرتے ہوئے یہ تبصرہ فرمایا ''ان حالات میں جن کا میں ذکر کر رہا ہوں ایک سماج کا ان پڑھ ہونا لازمی ہے، ہندوستان میں علمی مراکز و کالجز کا قیام کس طرح ممکن ہوسکتا ہے۔بھلا ایسے آدمی کہاں جو انہیں قائم کریں اور اگر ایسے آدمی مل بھی جائیں تو بھلا طلبہ کہاں، ایسے افراد کہاں جن کے پاس اتنی دولت ہو کہ وہ اپنے بچوں کے کالج کا خرچ برداشت کرسکیں اور اگر کسی کے پاس اتنی دولت ہو بھی تو بھلا کون اپنی دولت اس طرح ظاہر کرنے کی ہمت کرسکتا ہے''۔ (F.Bernier, *Travels in the Mogul Empire* (1656-1668) (Eng.Tr.A. Constable), Oxford University Press, London,1934, p,229) مزید برآں یہاں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ علامہ شبلی نے سرسید کی تحریک پر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس (منعقدہ ۲۷۔۲۹ر دسمبر ۱۸۸۷ء بمقام لکھنؤ) میں ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا جو کافی پسند کیا گیا اور ۱۸۸۸ء میں یہ رسالہ کی صورت میں شائع ہوا۔اس مقالہ میں عہد اسلامی کے ہندوستان کے سیاق میں انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا ''ہندوستان کے تذکرہ میں ہم کو بے خطر کہنا چاہئے کہ اس سرزمین میں شاید ایک بھی علمی عمارت قائم نہیں ہوئی لیکن اس ملک کی عام علمی فیاضیوں کا انکار نہیں

Marfat.com

کیا جا سکتا''۔ یہ علامہ شبلی کی علمی دیانت داری ہے جو یقیناً قابل تعریف و لائق تقلید ہے کہ جب انہیں عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے مدارس کے بارے میں معلومات میسر ہوئیں اور اپنے بیان کی غلطی واضح ہوگئی تو انہوں نے اپنے بیان سے رجوع کرتے ہوئے اس رسالہ کے اپنے نسخہ (ص ٦٦) پر یہ نوٹ تحریر فرمایا ''میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میری یہ تحقیق صحیح نہیں ثابت ہوئی، ہندوستان میں بہت سے مدارس تعمیر ہوئے تھے گو اب کا ان نام و نشان باقی نہ رہا''۔ جب یہ مقالہ بعد میں مقالات شبلی میں شامل کیا گیا تو جلد سوم (طبع اول، ۱۹۳۲ء) کے متعلقہ صفحہ (۷۴) کے حاشیہ نمبر ۳ میں بھی ان کا یہ نوٹ درج ہوا۔ (مذکورہ رسالہ پر علامہ شبلی کے رقم کردہ اس نوٹ کے بارے میں مجھے برادر مکرم جناب مولانا محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی صاحب (رفیق دارالمصنفین) نے مطلع فرمایا۔ اس تعاون کے لئے میں اُن کا تہ دل سے ممنون ہوں)۔

جدید دور کے بہت سے مورخین و مصنفین تو عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے سماجی، تمدنی، تعلیمی حالات کی منفی تصویر پیش کرنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں اور پورا زور قلم یہ تاثر دینے میں صرف کرتے ہیں کہ اس دور کے مسلم حکمرانوں نے تعمیرات میں بے حساب دولت لٹانے، فوجی مہمات میں اپنی بیشتر توانائیاں و وسائل خرچ کرنے اور دربار و حرم سرا میں عیش و عشرت کی زندگی گذارنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا۔ ایک جدید مصنف نے اپنی انگریزی کتاب میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ہندوستان کے کچھ مسلم حکمراں مسلم طلبہ کے لئے اعلیٰ تعلیم کے اہتمام سے زیادہ دلچسپی ہندوؤں اور بدھوں کے تعلیمی اداروں کو تباہ کرنے میں رکھتے تھے (کرشن لال رائے، ایجوکیشن ان میڈیول انڈیا، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۲۹)۔ عہد زیر بحث میں عام تعلیم سے قطع نظر عورتوں کی تعلیم کے بارے میں اور زیادہ غلط تصورات پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں مسلمانوں کی مذہبی روایات بالخصوص پردہ کی رسم عورتوں کی تعلیم میں حارج تھی اور کچھ حضرات یہ تاثر دیتے ہیں کہ اس وقت کے مسلم معاشرہ میں کم عمر میں لڑکیوں کی شادی کے رواج کی وجہ سے ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جاتا تھا، بعض

Marfat.com

اہل قلم کی رائے میں اس زمانہ کے لوگ لڑکیوں کی تعلیم کو غیر ضروری سمجھتے تھے اور کچھ اسکالرس یہ تحقیق پیش کرتے ہیں کہ مذہبی ذہن رکھنے والے یا شریعت کی پابندی پر زور دینے والے لوگ لڑکیوں کی تعلیم کو جرم تصور کرتے تھے۔ اس طرح عہد اسلامی کے ہندوستان میں تعلیم کا مسئلہ بہت سے غلط تاثرات، مفروضات اور پروپیگنڈے میں محصور ہے۔ اس لئے صحیح صورتحال واضح کرنے کے لئے اس موضوع پر جتنا کچھ لکھا جائے کم ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ اردو میں اس سے متعلق متعدد کتب دستیاب ہیں اور ان میں بعض عمدہ و معلوماتی بھی ہیں۔ اس نوع کی چند قابل ذکر کتب یہ ہیں:

سید عبدالحئی الحسنی / مترجم: شمس تبریز خان	ہندوستان اسلامی عہد میں
ابوالحسنات ندوی	ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں
عبدالمجید سالک	مسلم ثقافت ہندوستان میں
ایس۔ ایم۔ جعفر / مترجم: سعید انصاری	تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں
سعید احمد رفیق	اسلامی نظام تعلیم

ان سب کتابوں کے باوجود موضوع کی اہمیت اور اس پر منفی مطالعات کی کثرت کے پیش نظر اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اس موضوع پر مطالعہ جاری رکھا جائے اور مستند ماخذ سے متعلقہ مواد تلاش کر کے مختلف نہج سے اس کا تجزیہ کیا جائے۔ اسی احساس کے تحت یہ کوشش کی گئی ہے اور اس میں مدارس اور اعلی تعلیم کے دیگر ذرائع کے علاوہ اس کی درسیات اور طریقۂ تدریس سے بھی بحث کی گئی ہے۔ تعلیم نسواں پر مواد کی قلت کے باوجود جو کچھ بکھری ہوئی معلومات مل سکیں انہیں مرتب انداز میں تجزیہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مختلف ابواب کے تحت جو مطالعات پیش کئے گئے ہیں ذیل میں ان کا مختصر تعارف مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ عہد وسطی کے ہندوستان میں تعلیم کے سب سے اہم ذرائع مدارس اور تدریس کے انفرادی مراکز تھے اور اب بھی دینی تعلیم کی حد تک یہی صورت حال برقرار ہے۔ درحقیقت ہندوستان میں تعلیم کی اشاعت میں ان اداروں

Marfat.com

کی بڑی خدمات رہی ہیں، یہ اور بات ہے کہ آجکل اہلِ ہند کے ایک طبقہ کی جانب سے ان اداروں کو بدنام کرنے کی مذموم مہم جاری ہے۔ اس سرزمین میں مدارس کے قیام اور نظم میں علماء کی دلچسپی اور جد و جہد اور اہلِ حکومت کی سرپرستی کا بہت دخل رہا ہے۔ اس وقت درس و تدریس کو نیک مشغلہ اور باعث خیر سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے یہ حضرات اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور سلاطین اپنی دینی و علمی خدمات میں مساجد کی تعمیر، مدارس کے قیام اور دینی علوم کی اشاعت میں مصروف رہنے والوں کی حوصلہ افزائی کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ اس عہد میں کوئی شہر یا بڑا قصبہ مدرسہ سے خالی نہیں تھا اور مکتب تو ہر چھوٹی بڑی مسلم آبادی میں پایا جاتا تھا۔ پیش نظر کتاب میں خاص طور سے عہدِ سلطنت کے مدارس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عہد مغلیہ مدارس سے خالی تھا بلکہ حقیقت یہ کہ اس عہد میں تعلیمی و ثقافتی سرگرمیوں میں اور اضافہ ہوا، قدیم مدارس کی مرمت اور ترقی کے علاوہ کثیر تعداد میں نئے مدارس بالخصوص نئے مفتوحہ علاقوں میں قائم ہوئے۔ گرچہ اس کتاب میں اس دور کے مدارس کا مطالعہ شامل نہیں ہے لیکن عہدِ سلطنت کے مدارس پر تفصیلی مطالعہ میں مدارس کے قیام و انصرام، ان امور میں علماء و اہلِ حکومت کی دلچسپی، نصاب تعلیم اور طرز تدریس سے متعلق وافر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس سے پورے مسلم عہد میں مدارس کی کارکردگی کا یک اجمالی خاکہ سامنے آجائے گا۔

عہدِ زیرِ بحث میں درس و تدریس اور علم کی ترقی کے لئے مدارس کے علاوہ دوسرے ذرائع بھی اختیار کئے جاتے تھے، ان میں تدریس کے انفرادی مراکز، کتب خانے، علمی مجلسیں اور تجربہ گاہیں شامل تھیں۔ خاص طور سے تعلیم کے اعلیٰ مرحلہ میں انفرادی مراکزِ تدریس کو کافی اہمیت و مقبولیت حاصل رہی ہے، یعنی کسی بھی مضمون میں اختصاص کے لئے اس مضمون کے ماہر استاد سے درس لینے یا ان کے مرکزِ تدریس سے استفادہ کرنے کا زیادہ رواج تھا۔ بلاشبہ کتب خانے، علمی مجالس، مباحثے اور تحقیق و تجربہ کے مراکز علم کو وسعت دینے، معلومات میں اضافہ کرنے اور علمی استعداد بڑھانے میں معاون بنتے تھے۔ ''اعلیٰ تعلیم کے ذرائع'' سے متعلق باب میں ان امور

Marfat.com

سے بحث کرتے ہوئے یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس زمانہ میں علم کے حصول وفروغ کے لئے یہ تمام ذرائع اختیار کئے جاتے تھے اور یہ کہ مختلف علوم کے ماہرین پیدا کرنے میں انفرادی مراکز تعلیم سب سے اہم کردار ادا کرتے تھے۔

کسی بھی دور کے تعلیمی نظام کے مطالعہ میں نصاب تعلیم سے بحث اس کا لازمی جز ہوتا ہے۔ درحقیقت نصاب ہی سے اس دور کے نظام تعلیم کی خصوصیات معلوم ہوتی ہیں اور علماءِ وقت کے تعلیمی رجحانات بالخصوص نصاب پر ان کے اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مسلم عہدِ حکومت میں نصاب میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ہوتی رہی ہے، لیکن اس کا زیادہ تر تعلق کسی مضمون کی کتابوں کی تبدیلی یا ان میں کمی وبیشی سے ہے۔ مضامین کی حد تک تبدیلی بہت کم ہوئی ہے، دوسرے اس باب میں نامور علماء کے ذہنی رجحانات کی کارفرمائی زیادہ رہی ہے۔ اسی لئے اس عہد کے سیاق میں ان تمام باتوں کا جائزہ اعلیٰ تعلیم کی درسیات کے تحت لیا گیا ہے نہ کہ نصاب تعلیم کے پیرایہ میں۔ بہرحال اس مطالعہ سے یہ سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ کس دور میں کس مضمون یا کن مضامین میں علماء وحکمرانوں کی دلچسپی زیادہ رہی ہے، دوسرے یہ کہ اس زمانہ کی درسیات میں ہندوستانی علماء کی تیار کردہ کتابوں کا کتنا حصہ رہا ہے۔

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ اسلام میں علم کا حصول بلا کسی تفریق مرد وزن سب کے لئے مطلوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشرہ میں تعلیم نسواں کا رواج کسی نہ کسی طور پر ہر دور میں رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زمانہ کے حالات یا وقت کے تقاضے کے تحت اس کے طور وطریق میں کچھ تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ عہد وسطیٰ کے سیاق میں اس موضوع پر مطالعہ اس وجہ سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس وقت کا معاشرہ زیادہ روایت پسند تھا اور اس کے بارے میں ایک تصور یہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم پر توجہ نہیں دی جاتی تھی اور یہ کہ خاص طور سے دینی ذہن رکھنے والے اس کے مخالف تھے۔ پھر اسی بنیاد پر یہ مفروضہ قائم کیا جاتا ہے کہ مذہب اسلام میں عورتوں کی تعلیم کی ترغیب نہیں دی جاتی۔ عہد اسلامی کے ہندوستان میں تعلیم نسواں پر خاطر خواہ مواد نہ ملنے کے باوجود اس سے متعلق جو کچھ

Marfat.com

معلومات فراہم ہو سکی ہیں ان سے بڑے اہم و دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں اور اس باب میں بہت سے غلط تصورات و مفروضات کے تار و پود بکھر جاتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ اس ماحول میں جہاں عورتوں کی تعلیم کی تصویر بہت دھندلی دکھائی جاتی ہے خود عورتوں کا مدارس قائم کرنا اور علم کی اشاعت میں حصہ لینا بڑا تعجب خیز معلوم ہوتا ہے۔ اس موضوع پر بھی کچھ بکھری ہوئی معلومات اس کتاب میں جمع کی گئی ہیں جن سے عہد وسطی میں خواتین کی علمی دلچسپیوں کے کچھ نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ یہاں اس اعتراف میں کوئی تکلف نہیں محسوس ہوتا کہ تعلیم نسواں اور تعلیم کی اشاعت میں عورتوں کی خدمات پر ہماری معلومات ابھی محدود بلکہ ناقص ہیں۔ جو کچھ مواد دستیاب ہے اس کا غالب حصہ سلاطین و امراء کے گھرانہ کی بنات و خواتین سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے متعلقہ عہد کے مختلف النوع مآخذ کو مزید کھنگالنے اور ان سے معلومات اخذ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس موضوع پر مطالعہ کو اور آگے بڑھایا جا سکے۔

پیش نظر کتاب کے بعض ابواب مضامین کے صورت میں سہ ماہی تحقیقات اسلامی (علی گڑھ) اور مجلہ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) میں شائع ہوئے تھے۔ اس کتاب میں شامل کرنے سے قبل ان پر نظر ثانی کی گئی ہے اور ان کے مواد میں کچھ ترمیم و اضافہ بھی ہوا ہے۔ یہ کتاب دراصل عہد اسلامی کے ہندوستان کی تاریخ کے ایک طالب علم کی ایک ادنیٰ کاوش ہے۔ اپنے موضوع پر کوئی بہت مبسوط و جامع مطالعہ نہیں ہے۔ البتہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مستند مآخذ بالخصوص تاریخی کتب و تذکروں کی روشنی میں اس عہد کے تعلیمی نظام اور تعلیم کی اشاعت میں مسلم معاشرہ کے مختلف طبقوں کی خدمات کو سامنے لایا جائے اور دلائل و شواہد کی بنیاد پر اس حقیقت سے پردہ اٹھایا جائے کہ عہد وسطی کے مسلم معاشرہ میں بہت سی خرابیوں کے باوجود اہل اسلام تعلیم کے اہتمام سے غافل نہیں تھے۔ اس کتاب میں اردو و انگریزی کے ثانوی مآخذ سے بھی مدد لی گئی ہے اور بعض مباحث یا مسائل میں انہی پر انحصار کرنا پڑا جن سے متعلق معاصر مآخذ میں کچھ نہیں مل سکا۔ اس کتاب میں کچھ مقامات پر مواد کے ناکافی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ عہد وسطی کے فارسی مآخذ یا تاریخی کتب

Marfat.com

میں تعلیم سے متعلق مفصل و مرتب انداز میں مواد نہیں ملتا، بلکہ اس موضوع پر مطالعہ کرنے والوں کو بکھری ہوئی معلومات کو دانہ دانہ کر کے جمع کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال کسی بھی موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے ہمہ گیریت و جامعیت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ عہدِ اسلامی کے ہندوستان کے سیاق میں دوسرے موضوعات کی طرح تعلیم کے مسئلہ پر بھی مواد کی تلاش وجستجو کا سلسلہ جاری رہے گا جو اس میدان میں مطالعہ و تحقیق کے کام کو اور آگے بڑھائے گا۔

میرے لئے یہ موجب سعادت ہے کہ یہ کتاب دارالمصنفین سے شایع ہو رہی ہے جس سے انتساب باعث عز و شرف سمجھا جاتا ہے۔ میں اپنے کرم فرما گرامی قدر مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب (ناظم دارالمصنفین) کا انتہائی ممنون ہوں کہ انہوں نے کتاب کے مسودہ پر نظر ڈالی، اس میں ضروری تصحیح فرمائی اور دارالمصنفین سے اس کی اشاعت کو قبولیت بخشا۔ میں محترم جناب عبدالمنان ہلالی صاحب (جوائنٹ سکریٹری دارالمصنفین) کا بھی تہِ دل سے شکر گذار ہوں کی ان کے حسن اہتمام سے یہ کتاب زیورطبع سے آراستہ ہوئی۔

اللہ کرے میری یہ حقیر کاوش ہندوستان میں مسلم عہدِ حکومت کی تاریخ کے شیدائیوں کے لئے دلچسپی وافادیت کا باعث بنے اور اس راقمِ عاجز کو مزید علمی کاوشوں کی توفیق ملے۔

[وقل رب زدنی علما]

ظفر الاسلام اصلاحی
شعبۂ اسلامک اسٹڈیز
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲

۲۸ ذی قعدہ، ۱۴۲۷ھ
۲۰/دسمبر، ۲۰۰۶ء

Marfat.com

باب اوّل

عہدِ سلطنت کے مدارس - ایک جائزہ

اسلام وعلم اور مسلمان وتعلیم میں بہت ہی گہرا تعلق ہے۔ متعدد قرآنی آیات واحادیث نبویؐ سے اس کے واضح ثبوت ملتے ہیں ہیں۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے ہر علم نافع قابلِ قدر اوراس کا حصول مطلوب ہے۔ درحقیقت اسلام میں علم کا حصول بجائے خود مطلوب ہے۔ دوسرے مذہب کی بہت سی ضروریات تعلیم سے منسلک ہیں۔ تیسرے اسلام جس نہج پر شخصیت کی تعمیر کرنا چاہتا ہے اس کا بھی یہی تقاضا ہے کہ اس کے ماننے والے علم سے بہرہ ور ہوں، اس کی اشاعت کا اہتمام کریں اور دوسروں کو اس متاعِ بے بہا سے مستفیض کرنے میں ہر ممکن تعاون دیں۔ ان سب سے اہم یہ کہ قرآن کریم کی نگاہ میں علم میں وسعت وترقی پسندیدہ ہے اور اس عظیم ترین کتاب ہدایت نے اس باب میں جہد مسلسل کی تعلیم دی ہے اور یہ دعا بھی سکھائی ہے۔ وقل رب زدنی علما (طٰہٰ/١١٤) (اور کہہ، اے میرے رب مجھے مزید علم عطا کر) لیکن اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ تمام علوم میں اس علم کا اکتساب سب سے زیادہ ضروری ہے جو صراط مستقیم کا پتہ دینے والا اور کامیابی کی راہ پر گامزن کرنے والا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے جس سرزمین میں قدم رکھا خواہ فاتحانہ حیثیت سے یا کسی اور روپ میں انھیں اپنے متعلقین کے ساتھ کسی جگہ مستقل سکونت اختیار کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے سب سے پہلے فریضہ اول کی اجتماعی بجاآوری کا اہتمام کیا یعنی مسجد تعمیر کی اور پھر اسی میں اس سے ملحق دینی تعلیم کے لئے مکتب یا مدرسہ قایم کیا۔ یہ سلسلہ آج سے نہیں بلکہ پہلی صدی ہجری سے جاری ہے اور تاریخ میں اس کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔ مسلمانوں نے یہ روایت دنیا کے مختلف

Marfat.com

حصوں میں قایم کی خواہ اس کا تعلق مصر، ایران، شام سے ہو یا اسپین، سسلی وشمالی افریقہ سے یا ترکی، مرکزی ایشیاء اور برصغیر ہندوپاک سے ہو۔ اسلامی تاریخ میں عام طور پر باقاعدہ مدارس کے قیام کی ابتدا چوتھی صدی ہجری کے آخر سے منسوب کی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں دینی تعلیم کے اہتمام کا سلسلہ عہد نبویؐ سے جاری ہوا۔ درسگاہ مسجد قبا، دارارقم، مسجد نبویؐ اور اس سے متصل صفہ درسگاہ میں تعلیم وتربیت کی مصروفیات اس پر شاہد ہیں[1]۔ چوتھی وپانچویں صدی ہجری کے معروف مدارس میں مصر کا جامع ازہر، اصفہان کا مدرسہ ابوبکر الاصفہانی، نیشاپور کا مدرسہ ابواسحق الاسفرائینی اور بغداد کا مدرسہ نظامیہ شامل ہے[2]۔ جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں (مالابار وغیرہ) میں عرب تاجروں کی نوآبادیات میں مساجد کے قیام ودینی تعلیم کے اہتمام کا سلسلہ ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوچکا تھا لیکن برصغیر میں باقاعدہ قیام مدارس کی روایت دوسری صدی ہجری یا آٹھویں صدی عیسوی سے جاری ہوئی۔ یہ بات بخوبی معروف ہے کہ ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کے زیر قیادت سندھ میں عربوں کی حکومت قایم ہوئی جسے بجا طور پر برصغیر میں مسلمانوں کی اولین حکومت کہا جاتا ہے۔ یہ پہلے یکے بعد دیگرے اموی وعباسی خلافت کے ماتحت اور پھر آزادانہ صورت میں ایک طویل عرصہ تک باقی رہی۔ اس دوران اس خطہ میں مختلف شہر اسلامی تہذیب وتمدن کے مرکز کی حیثیت سے نمایاں ہوئے ان میں خاص طور سے دیبل، منصورہ، ملتان واُچھ شامل تھے۔ دینی تعلیم کی اشاعت کے لئے ان میں مدارس قایم کئے گئے جیسا کہ مورخین کے بیانات سے اس کا ثبوت ملتا ہے[3]۔ جہاں تک شمالی ہندوستان میں مدارس کی داغ بیل پڑنے کا تعلق ہے اس کی ابتدا ترکوں کی فتوحات کے زمانہ میں ہوئی۔ سلطان محمود غزنوی فنِ حرب کے ماہر اور عظیم فاتح ہونے کے علاوہ علم وفن کے شایق اور اہلِ علم کے قدرداں اور مربی بھی تھے۔ ممتاز اسکالر اور ہندوستانیات کے ماہر (Indologist) ابوریحان البیرونی (م ۱۰۴۸ء) ان کے مصاحبین میں سے تھے[4]۔ اس بات کے واضح ثبوت دستیاب ہیں کہ قنوج کی فتح کے بعد غزنین واپسی پر سلطان

Marfat.com

محمود نے ایک مسجد و مدرسہ کی بنیاد رکھی اور اس میں ایک کتب خانہ بھی قایم کیا جس میں سلطنت کے مختلف حصوں سے قیمتی کتابیں جمع کرنے کا اہتمام کیا ۵۔ گرچہ قطعی شہادت دستیاب نہیں لیکن اس امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سلطان نے ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں میں بھی علم کی شمع روشن کی ہو۔ سلطان شہاب الدین غوری کے بارے میں عہد سلطنت کے اولین مورخ حسن نظامی کا بیان ہے کہ ۵۸۷ھ/ ۱۱۸۲ء میں اجمیر کی فتح کے بعد سلطان نے وہاں دینی تعلیم کی اشاعت کا نظم کیا اور ایک دو نہیں متعدد مدارس قایم کیے ۶۔

۱۲۰۶ء میں دہلی سلطنت کے قیام کے بعد جب ہندوستان میں مسلمانوں کا اقتدار مستحکم ہوا تو اس سرزمین میں اسلامی تہذیب وتمدن کی جڑیں اور مضبوط ہوئیں اور دہلی کے علاوہ دوسرے قصبات و شہروں میں کثیر تعداد میں مکاتب و مدارس قایم ہوئے۔ ان کی بڑھتی ہوئی تعداد کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ عرب مورخ احمد القلقشندی کے بیان کے مطابق سلطان محمد بن تغلق کے عہد (۱۳۲۵ـ۱۳۵۱ء) میں صرف دہلی کے مدارس کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی تھی ۷۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں تعلیم کا اہتمام تین طریقے سے ہوتا تھا۔ (۱) تعلیم کے انفرادی مراکز کے ذریعہ۔ ان کے تحت مختلف فنون کے اساتذہ اپنے اپنے مقام پر یا مسجد میں اپنے اختصاصی مضمون (تفسیر، حدیث، فقہ، یا عربی و فارسی زبان وادب وغیرہ) پر درس دیتے تھے۔ (۲) سلاطین و امراء یا عام اہل خیر کے قایم کردہ مدارس کے توسط سے۔ اس نظم کے تحت مقررہ اوقات، متعینہ نصاب اور مراحل تعلیم کی تقسیم کے ساتھ تعلیم دی جاتی تھی۔ (۳) گھروں پر مقرر کردہ پرائیوٹ ٹیچرس یا ٹیوٹرس کے وسیلہ سے۔ انھیں اُس زمانہ میں معلم، مودب یا اتالیق کہا جاتا تھا ۸۔ یہاں خاص طور سے دوسرے ذریعہ تعلیم کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچانی مقصود ہے۔ درحقیقت عہد زیر بحث میں مدارس کا قیام و انصرام عوامی فلاح و بہبود کے کاموں میں شامل تھا۔ اور شاید ہی کوئی ایسا سلطان ہو جس کے کارناموں میں اس کا

Marfat.com

ذکر نہ ملتا ہو۔ انھیں جو خاص اہمیت حاصل تھی اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کی عمارت ان عمارتوں میں شامل تھی جنہیں ''بقاع خیر'' (مراکزِ خیر) کہا جاتا تھا۔ سلاطین ہند کے تذکرے میں یہ عام بیان ملتا ہے۔ ''درحکومت خود تالا بہا و چاہ ہا و پلہا بستند و بر طرف دیگر عمارات و بقاع خیر نیز بنا نہادند'' (اپنے عہد حکومت میں بہت سے تالاب، کنوئیں و پل بنوائے اور ہر جگہ دوسری قسم کی عمارتیں اور بقاع خیر تیار کرائے)۔ بعض جدید مصنفین کے بقول ''بقاع خیر'' میں مسجدیں، دینی تعلیم گاہیں وخانقاہیں شامل تھیں ۹۔ سلاطین دہلی نے مدارس کے قیام اور ان کے نظم ونسق میں جو دلچسپی یا سرگرمی دکھائی اس کی کچھ تفصیلات ذیل میں پیش کی جارہی ہیں:

سلطان قطب الدین ایبک (۱۲۰۶۔۱۲۱۰ء) خود علم سے بہرہ ور تھے اور اہل علم کی قدر بھی کرتے تھے۔ ان کی تعلیم وتربیت قاضی فخر الدین کوفی کی زیر نگرانی ہوئی تھی سلطان نے مفتوحہ علاقوں میں متعدد مساجد تعمیر کرائیں جن میں دینی تعلیم کا نظم قایم ہوا۔ اس عہد میں بعض مدارس کی تعمیر کا بھی ثبوت ملتا ہے جیسا کہ فخر مدبر نے ذکر کیا ہے کہ اس وقت ایسے ایسے شہروں وقصبوں میں مساجد و مدارس کی تعمیر کا سلسلہ جاری ہوا جہاں پہلے کبھی اسلام کا نام لیوا کوئی نہیں تھا ۱۰۔ سلطان التمش (۱۲۱۰۔۱۲۳۵ء) کے بارے میں تاریخی مآخذ سے یہ ثابت ہے کہ انھوں نے دہلی میں متعدد مدارس تعمیر کرائے جن میں مدرسہ معزی سب سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ سلطان معزالدین محمد بن سام (شہاب الدین غوری) کے نام سے موسوم تھا اس مدرسہ کے اساتذہ میں ممتاز عالم مولانا بدرالدین اسحاق خویش وخلیفہ خواجہ فریدالدین گنج شکر بھی شامل تھے ۱۱۔ بعض جدید اسکالرس نے مدرسہ معزی کا قیام سلطان قطب الدین ایبک کے زمانہ سے منسوب کیا ہے ۱۲۔ دوسرے یہ حوالہ بھی ملتا ہے کہ عہد التمش میں بدایوں میں مدرسہ معزی کے نام سے ایک مدرسہ قایم کیا گیا تھا ۱۳۔ سلطان نے شہزادہ ناصرالدین محمود کی وفات (۶۲۶ھ/ ۱۲۲۸ء) پر انہی کے نام پر دہلی میں مدرسہ ناصریہ قایم کیا تھا۔ بعض کتابوں میں غلط طور سے یہ لکھا ہوا ہے کہ یہ سلطان کے والد کے نام پر قائم تھا ۱۴۔

Marfat.com

بعد میں سلطان رضیہ کے دور میں صاحب ''طبقات ناصری'' اسی مدرسہ کے مہتمم مقرر ہوئے تھے ۱۵۔ اسی دور میں ناصر الدین قباچہ (صوبہ دار سندھ) نے اس علاقہ میں اپنی آزاد حکومت قایم کی جو تقریباً ۱۷ برس (۱۲۱۰۔۱۲۲۷ء) باقی رہی۔ انھوں نے اُچھ کو اپنا دار الحکومت بنایا تھا اور اپنی علم دوستی سے اسے علم و فن کا مرکز بھی بنا دیا۔ اسی قصبہ میں ان کے دور میں ایک عظیم الشان مدرسہ قایم تھا جو ''مدرسہ فیروزی'' کے نام سے معروف تھا۔ گرچہ قطعی طور پر یہ ثابت نہیں ہے کہ اسے ناصر الدین نے بنوایا تھا لیکن معاصر مورخ منہاج السراج نے یہ صراحت کی ہے کہ ناصر الدین نے ۶۲۴ھ/۱۲۲۶ء میں اس کا انتظام ان کے سپرد کیا تھا ۱۶۔ جدید مورخین کے بیان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مدرسہ پہلے سے موجود تھا۔ ناصر الدین قباچہ نے اس کے انتظام کو بہتر بنایا اور اسی مقصد سے اس کا نظم قاضی منہاج کے سپرد کیا ۱۷۔ مزید براں ناصر الدین کے بارے میں یہ بھی مذکور ہے کہ انھوں نے خود ملتان میں مولانا قطب الدین کاشانی کے لئے ایک مدرسہ قایم کیا اور مولانا ہی کو اس کا مہتمم مقرر کیا ۱۸۔ اسی علاقہ میں ملتان میں شیخ بہاء الدین زکریا (م ۱۲۶۲ء) کی خانقاہ میں ایک مدرسہ کے قیام کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سے فیض یاب ہونے والوں میں مشہور سہروردی صوفی سید جلال الدین حسین بخاری مخدوم جہانیاں (م ۱۳۸۳ء) بھی شامل تھے ۱۹۔ لیکن اس بارے میں کوئی وضاحت دستیاب نہ ہو سکی کہ یہ مدرسہ کب اور کس کے ذریعہ قائم ہوا تھا۔

سلطانہ رضیہ (۱۲۳۶۔۱۲۳۹ء) ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور سیاسی تدبر اور حکمرانی کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور تھیں۔ انھوں نے مدارس کے انتظام میں دلچسپی لی اور علم و فن کی اشاعت پر بھی توجہ دی ان کے عہد میں دہلی کے مدرسہ معزی نے کافی ترقی کی اور بعض مورخین کے بیان کے مطابق اس کی شان و شوکت میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا کہ جب ۶۳۵ھ/۱۲۳۸ء میں قرامطہ نے دہلی پر حملہ کیا تو اسے جامع مسجد سمجھ کر اس پر چڑھائی کر دی ۲۰۔ سلطان ناصر الدین محمود (۱۲۴۶۔۱۲۶۵ء) بھی ایک علم دوست حکمران تھے۔ بعض جدید مصنفین نے دہلی میں سلطان کے تعمیر کردہ مدرسہ

134735

Marfat.com

ناصریہ کا ذکر کیا ہے ۲۱۔ اور بعض نے لکھا ہے کہ ان کے نام پر یہ قایم کیا گیا تھا۔ یہ صراحت دونوں کے یہاں ملتی ہے کہ اس کے مہتمم قاضی منہاج السراج تھے ۲۲۔ ''طبقات ناصری'' سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مدرسہ ناصریہ دہلی میں پہلے سے تھا اور سلطانہ رضیہ نے قاضی منہاج کو ۶۳۵ھ/ ۱۲۳۸ء میں اس کا ذمہ دار مقرر کیا تھا ۲۳۔ ممکن ہے بعد کے زمانہ میں بھی وہ اس عہدہ پر فائز رہے ہوں۔ ایک جدید مصنف نے ''طبقات ناصری'' کے انگریزی ترجمہ کے حوالہ سے یہ ذکر کیا ہے کہ جالندھر میں بھی ایک مدرسہ عہدِ ناصری کی یادگار ہے جہاں سلطان کے وزیر اعظم بلبن اور ان کے رفقاء نے ایک مہم سے واپسی پر عید الاضحیٰ کی نماز ادا کی تھی ۲۴۔ لیکن اصل متن میں اس کی صراحت نہیں ملتی۔ مترجم نے محض ایک لفظ (کرہ) کے بارے میں یہ امکان ظاہر کیا ہے کہ یہ کارواں سرائے کے ہال یا کالج کے (the hall of *karwan sarai* or of a college) معنی میں لیا جا سکتا ہے ۲۵۔ یہاں یہ واضح رہے کہ طبقات ناصری کے مطبوعہ نسخہ میں کوہ جالندھر میں عید الاضحیٰ کی نماز ادا کرنے کا ذکر ہے (عید الاضحیٰ را بکوہ جالندھر نماز گذاردہ شد) ۲۶ لیکن طبقات کے انگریزی مترجم نے اسے ''کوہ'' کے بجائے ''کرہ'' زیادہ صحیح سمجھا ہے جس کے معنی سرائے یا مدرسہ کے ہال کے ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جالندھر سے پچاس میل کے اندر میں کسی پہاڑ یا پہاڑی کا ثبوت نہیں ملتا۔ سلطان غیاث الدین بلبن (۱۲۶۵ـ۱۲۸۷ء) کی علم دوستی و معارف پروری کا ذکر معاصر مآخذ میں ملتا ہے خاص طور سے یہ حوالہ دستیاب ہے کہ وہ بیت المال سے اصحاب علم و فن پر خوب داد و دہش کرتے تھے اور یہ کہ انھوں نے افسروں کو یہ خصوصی ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ اہل علم کی قدر دانی اور ان پر لطف و کرم میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھ چھوڑیں ۲۷۔ سلطان کے شہزادوں میں شہزادہ محمد اہل علم کی سرپرستی و اصحاب فضل کی قدر افزائی کیلئے زیادہ معروف تھے ۲۸۔ بلبن کے زمانہ کے علماء میں سیدی مولا کے بارے میں یہ شہادت ملتی ہے کہ انھوں نے دہلی میں ایک بڑا مدرسہ قایم کیا تھا جس میں بڑے لائق اساتذہ درس دیتے تھے ۲۹۔

Marfat.com

سلطان جلال الدین خلجی (۱۲۹۰ـ۱۲۹۵ء) نسبتاً غیر معروف حکمراں تھے لیکن ان کے عہد میں شاہی دربار علماء وفضلاء کا مرکز بن گیا تھا جن میں فقیہہ، مؤرخ فلسفی و منطقی سبھی شامل تھے۔ سلطان نے ان علماء کو خاص طور سے انعامات وعطیات سے نوازا جو درس وتدریس میں مصروف رہتے تھے انھوں نے امیر خسرو کو امراء کبار میں شامل کرتے ہوئے مصحف بردار مقرر کیا۔ ایک شاہی کتب خانہ بھی اس دور کی یادگار ہے اور بعض جدید مصنفین کے بیان کے مطابق اس کی نگرانی امیر خسرو کے سپرد تھی ۳۰۔ سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۹۵ـ۱۳۱۵ء) خود پڑھے لکھے اور اہل علم کے قدرداں تھے۔ ان کے دور میں دہلی اہل علم وفن کا اتنا بڑا مرکز بن گیا تھا کہ بقول ضیاء الدین برنی بغداد وسمرقند، کاشان واصفہان اور شیراز وتبریز بھی اس پر رشک کرنے لگے تھے ۳۱۔ اس بات کے واضح ثبوت دستیاب ہیں کہ سلطان نے مساجد، مدارس، مقابر وقلعوں کی تعمیر میں خصوصی دلچسپی لی۔ مدارس میں ایسے اساتذہ مقرر کیے گئے جو اپنے فن میں یکتائے زمانہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے مختلف حصوں بلکہ دوسرے ممالک سے بھی شائقین علم جوق درجوق دہلی آتے تھے اور ان اساتذہ سے کسب فیض کرتے تھے ۳۲۔ اس عہد میں جو علماء درس وتدریس اور علم وفن کی اشاعت کے لئے معروف ہوئے ان میں مولانا محی الدین کاشانی، مولانا ظہیر الدین بھکری، مولانا مغیث الدین بیانوی، شیخ حسام الدین گجراتی، مولانا شہاب الدین ملتانی ومولانا حمید الدین مخلص اور مولانا شمس الدین یحیٰی قابل ذکر ہیں ۳۳۔ مساجد کی تعمیر ومدارس کے قیام میں سلطان نے جو دلچسپی لی اس کا ثبوت ان القاب وآداب سے بھی ملتا ہے جو ان کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ علائی دروازہ کے جنوبی حصہ پر جو کتبہ نصب ہے اس میں سلطان کے نام کے ساتھ یہ القاب ملتے ہیں۔ ''مؤکد منابر معالم ومساجد وموطد قواعد مدارس ومعابد'' ۳۴۔ (عبادت گاہوں ودرس گاہوں کی بنیادوں کو قوت پہونچانے والے)۔ علاء الدین خلجی کے جانشیں قطب الدین مبارک خلجی کا عہد (۱۳۱۶ـ۱۳۲۰ء) سیاسی طور پر انتشار کا شکار رہا اور نظم ونسق بھی متاثر رہا لیکن بعض

مورخین کے بیان کے مطابق اہل علم وفن پر داد و دہش کی روایت اس دور میں بھی جاری رہی بلکہ سلطان جلال الدین نے انھیں وظائف و جاگیریں دینے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا اور سابق دور میں علماء وفضلاء کی جو جاگیر میں ضبط ہوگئی تھی انھیں بحال کیا۔ اس سے علم وفن کی اشاعت میں مدد ملی اور درس وتدریس کا سلسلہ مزید آگے بڑھا ۳۵۔ سلطان علاء الدین خلجی کے مقبرہ (جسے قطب الدین مبارک شاہ خلجی نے ۱۳۱۷ء میں تعمیر کرایا تھا) کے قریب ہی ایک مدرسہ کے قیام کا ثبوت ملتا ہے یہ مسجد قوۃ الاسلام اور قطب صاحب کی لاٹ سے متصل واقع تھا۔ اس کے زمانۂ تعمیر کے بارے میں کوئی قطعی شہادت دستیاب نہیں۔ قطب الدین ایبک، التمش اور قطب الدین مبارک خلجی میں سے کسی ایک کے عہد میں اس کی تعمیر کا امکان ظاہر کیا گیا ہے۔ بعض اہل قلم نے اس کی تعمیر سلطان قطب الدین مبارک خلجی سے منسوب کی ہے جبکہ دوسرے محققین کی رائے میں سلطان التمش نے مسجد قوۃ الاسلام توسیع کرتے ہوئے اسی کے قریب یہ مدرسہ بنوایا تھا ۳۶۔

سلطان غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰۔ ۱۳۲۵ء) علمی ذوق، دینی رجحان، وفیاضی کے لئے مشہور تھے۔ علماء وفضلا کے ساتھ بڑے ادب واحترام سے پیش آتے تھے۔ سلطان نے ایک اچھی روایت یہ قائم کی تھی کہ ہر خوشی کے موقع پر دہلی کے معززین واہلِ علم بالخصوص علماء ومفتیین، معلمین ومتعلمین اور مذکرین کو اپنے دربار میں دعوت دیتے تھے اور انھیں انعامات وعطیات مرحمت فرماتے تھے ۳۷۔ ان کے عہد میں کسی نئے مدرسہ کے قیام کا واضح ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ بعض مصنفین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ تغلق آباد سے کچھ دوری پر جونائی کا قلعہ تھا وہ اصلاً ایک مدرسہ تھا جسے غیاث الدین تغلق نے تعمیر کرایا تھا ۳۸۔ ان کے جانشین سلطان محمد بن تغلق (۱۳۲۵۔ ۱۳۵۱ء) گرچہ علوم عقلیہ سے خاص شغف رکھتے تھے تاہم ان کے عہد میں فقہ ودیگر دینی علوم کی اشاعت کے ثبوت ملتے ہیں۔ سلطان نے بیرونی علماء کو ہندوستان آنے کی دعوت دینے کے لئے اپنے مخصوص سفراء بھیجے تھے اور ان کے سفر کے اخراجات

Marfat.com

کے لئے خطیر رقوم مختص کی تھیں ۳۹۔ دہلی کے قریب سلطان نے خرم آباد آباد کیا تو وہاں ایک مسجد و مدرسہ بھی تعمیر کرایا۔ مشہور معاصر شاعر بدر چاچ نے اپنے ایک قصیدہ میں اس مدرسہ کا خصوصی ذکر کیا ہے۔ اور اس کی تاریخ تعمیر (۷۴۴ھ/۱۳۴۳ء) پر ایک قطعہ بھی کہا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے :

رئیس مدرسہ او معلم ادریس امام مسجد او طوطی شکر گفتار ۴۰

اوپر یہ ذکر آچکا ہے کہ بعض مورخین کے بیان کے مطابق اس عہد میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے ممکن ہے اس میں کچھ مبالغہ آرائی ہو اور اس کا قوی امکان ہے کہ ان میں سے بیشتر مدارس پہلے سے قایم چلے آرہے تھے۔ بہر حال اس بیان سے اس زمانہ میں مدارس کی کثرت کا ثبوت ملتا ہے۔ تغلق سلاطین میں فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱۔۱۳۸۸ء) شریعت کی ترویج، اسلامی علوم کی اشاعت، مدارس کے قیام اور رفاہ عام کے کاموں کے لئے سب سے زیادہ مشہور ہیں ۴۱۔ قدیم مدارس کی تعمیر نو و ترقی کے علاوہ دہلی و اس کے اطراف میں سلطان فیروز شاہ نے بہت سے نئے مدارس قائم کئے جیسا کہ خود سلطان نے اپنے کارناموں میں اس کا ذکر کیا ہے ۴۲۔ بعض مورخین نے عہد فیروز شاہی کے نئے مدارس کی تعداد تیس اور بعض نے پچاس بتائی ہے ۴۳۔ انہی میں وہ مدرسہ بھی شامل تھا جسے سلطان نے شہزادہ فتح خاں کے مقبرہ کے قریب بطور ایصال ثواب تعمیر کرایا تھا ۴۴۔ اس کے علاوہ اس دور کے دو اور بڑے مدرسے۔ مدرسہ بالا بند سیری اور مدرسہ فیروز شاہی کا ذکر ملتا ہے۔ اول الذکر کے ممتاز اساتذہ میں مولانا جلال الدین رومی اور مولانا نجم الدین سمرقندی شامل تھے ۴۵۔ موخر الذکر اس دور کا سب سے بڑا مدرسہ تھا جس کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا۔ تعلیم کی اشاعت میں سلطان فیروز شاہ کا ایک بڑا کارنامہ ہزاروں غلاموں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام تھا۔ اہم بات یہ کہ حکومت کی زیر نگرانی دینی تعلیم و تربیت کے ساتھ انہیں حرفتی و تکنیکی تربیت دینے کا نظم بھی تھا ۴۶۔ اتنی کثیر تعداد میں نوجوان غلاموں کی تعلیم و تربیت کے نظم سے مختلف طبقے کے لوگوں میں تعلیم کے ترویج اور علم کی اشاعت میں

Marfat.com

سلطان کی گہری دلچسپی کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

تغلق سلاطین کے بعد سید ولودی خاندان کے حکمراں یکے بعد دیگرے دہلی سلطنت پر متمکن ہوئے۔ گرچہ علمی وثقافتی اعتبار سے سادات خاندان کا زمانۂ حکومت مشہور نہیں ہے لیکن علم وفن کے فروغ میں اس دور کی بعض خدمات قابل ذکر ہیں اور وہ ہے علمی اعتبار سے بدایوں کو ترقی دینا، اس قصبہ میں مدارس قایم کرنا اور تعلیم کو رواج دینا۔ ظاہر ہے یہ کام علماء وفضلاء کے بغیر انجام نہیں پا سکتا تھا۔ اس خاندان کے حکمرانوں میں خضر خاں (۱۴۱۴۔۱۴۲۱ء) اور مبارک شاہ (۱۴۲۱۔۱۴۳۳ء) کی علم دوستی واہل علم کی قدردانی سے یہ شہر علماء وفضلاء سے معمور ہو گیا جن کے فیض سے یہاں علمی ماحول کی قائم ہوا ۴۷۔ سلطان بہلول لودھی (۱۴۵۱۔۱۴۸۸ء) نے بدایوں میں کچھ اور مدارس قایم کئے اور اس شہر کی علمی فضا کو مزید پروان چڑھایا۔ سلطان ذاتی طور پر علم وفن کا دلدادہ تھا اس نے علماء کو وظائف ومدد معاش آراضی مرحمت کرنے میں بڑی فیاضی دکھائی ۴۸۔ اس نے بدایوں کے علاوہ دوسرے قصبات میں متعدد مکاتب ومدارس قایم کئے ۴۹۔ اسی سلطان نے آگرہ شہر بسایا س جسے اس کے جانشیں سکندر لودی (۱۴۸۸۔۱۵۱۷ء) نے پایہ تخت کے طور پر اختیار کیا اور مزید ترقی دیا۔ یہ حکمراں بھی علم وفن کا دلدادہ تھا اور اہل علم کی صحبت پسند کرتا تھا۔ اس نے بھی آگرہ میں متعدد مدارس قایم کئے اور اس شہر کو علماء وفضلا کا گہوارہ بنا دیا ۵۰۔ سلطان کو معقولات سے خاص شغف تھا اور اس نے ان علوم کے ماہرین کی سرپرستی فرمائی جن میں شیخ عزیز اللہ تلنبی اور شیخ عبداللہ تلنبی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ موخر الذکر کی دہلی آمد کے موقع پر سلطان نے وہاں ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا اور انھیں اس کا مہتمم مقرر کیا تھا۔ سلطان خود ان کے درس میں شریک ہوتا تھا، مشہور روایت کے مطابق انہی علماء کے زیر اثر مدارس میں معقولات کی درسیات میں اضافہ ہوا ۵۱۔ اسی طرح سلطان مشہور محدث شیخ رفیع الدین شیرازی کے بڑے معتقد اور ان کے علم وفضل سے بہت متاثر تھے۔ آگرہ میں ان کے لئے مکان تعمیر کرایا جس میں وہ تقریباً تیس سال تک حدیث

Marfat.com

کا درس دیتے رہے۔ اس کی حیثیت مدرسہ کی ہوگئی تھی اس لئے بعض جدید اہل قلم نے یہ صاف لکھ دیا ہے کہ سلطان نے آگرہ میں ان کے لئے مدرسہ تعمیر کرایا تھا ۵۲۔ سکندر لودی نے آگرہ و دہلی کے علاوہ متھرا میں متعدد مدارس قایم کیے اور ان کے نگراں مقرر کیے۔ فرشتہ کے بقول متھرا جو ہندوؤں کا مذہبی مرکز تھا۔ سلطان کی توجہ سے مساجد، مدارس اور سرایوں سے آباد ہوگیا ۵۳۔ اس کے علاوہ پھلت، سامانہ اور بعض دوسرے غیر معروف قصبات میں مدارس کا قیام سلطان کی علم دوستی اور تعلیم کی اشاعت میں دلچسپی کا مظہر ہے ۵۴۔ مزید براں اسی ضمن میں سلطان کی ایک اور اہم خدمت نئے مفتوحہ علاقوں میں تعلیم کا نظم کرنا اور فوجیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینا تھا۔ اس نے فوجی افسران کے لئے تعلیم کو لازمی قرار دیا اور ان کی دینی تربیت کا بھی اہتمام کیا ۵۵۔ اس دور میں علوم اسلامیہ کی ترویج میں سید رفیع الدین صفوی، شیخ حسام الدین، شیخ عبدالوہاب اور شیخ سعداللہ کا اہم کردار رہا ہے ۵۶۔

سور خاندان کے حکمرانوں میں شیر شاہ سوری (۱۵۴۰۔۱۵۴۵ء) سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ نظم و نسق میں اصلاح و ترقی، رفاہ عام کے کاموں میں گہری دلچسپی کے علاوہ وہ علمی ذوق و شوق اور علوم و فنون کی اشاعت پر توجہ دینے کے لئے بھی معروف ہیں۔ وہ خود فارسی زبان و ادب کے ماہر تھے اور اہل علم کی صحبت پسند کرتے تھے۔ انھوں نے شیراز ہند جونپور کے علماء سے کسب فیض کیا جن میں ممتاز مفسر قرآن ملک العلماء شیخ شہاب الدین دولت آبادی بھی شامل تھے۔ سلطان نے متعدد مدارس قایم کیے ۵۷۔ اپنے عہد حکومت سے قبل انھوں نے نارنول (پٹیالہ، پنجاب) میں بھی ایک مدرسہ اپنے دادا ابراہیم سور کے مقبرہ کے قریب کار خیر کے طور پر تعمیر کرایا۔ مزید براں شیر شاہ نے مدارس و خانقاہوں کے اخراجات کے لئے سرکاری خزانہ سے خطیر رقمیں بھی مختص کی تھیں ۵۸۔

ان تفصیلات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سلاطین دہلی نے مدارس کے قیام و انصرام میں گہری دلچسپی لی جس کا خوشگوار نتیجہ یہ سامنے آیا کہ نہ صرف دہلی بلکہ دیگر

Marfat.com

شہروں میں بہت سے مدارس وجود میں آئے اور تعلیم کی ترویج اور علوم اسلامیہ کی اشاعت کی راہیں ہموار ہوئیں۔

عہدِ سلطنت کے مدارس کو موٹے طور پر دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک وہ مدرسے جنہیں سلاطین و امراء نے قائم کیے اور حکومت کی زیر سرپرستی ان کی توسیع و ترقی ہوتی رہی۔ عہد زیر بحث میں انہی مدارس کی کثرت تھی اور معاصر تاریخی مآخذ میں انہی کا زیادہ ذکر ملتا ہے۔ اس عہد میں انفرادی طور پر قایم شدہ باضابطہ مدارس (یا آج کل کی اصطلاح میں غیر سرکاری مدارس) کم تھے۔ لیکن دوسری جانب تدریس کے انفرادی مراکز کثرت سے پائے جاتے تھے جو افادیت و مقبولیت کے اعتبار سے کسی بھی صورت میں مدارس سے کم تر نہیں تھے بلکہ قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر مضامین کی اختصاصی تعلیم (Specialised education) میں ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند تھا، یہی وجہ ہے کہ اصحابِ علم و فضل کے تذکروں میں تعلیم کے انہی انفرادی و اختصاصی مراکز سے اکتساب فیض کا حوالہ زیادہ ملتا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اعلیٰ مرحلہ میں مختلف علوم و فنون کی اختصاصی تعلیم مہیا کرنے میں ان مراکز تدریس کا کردار زیادہ اہم رہا ہے ۵۹۔

جہاں تک عہد سلطنت کے مدارس یا تدریس کے انفرادی مراکز میں رائج نصاب تعلیم کا تعلق ہے اس باب میں بہت کم تفصیلات دستیاب ہیں۔ معاصر علماء و فضلاء اور صوفیاء شعراء کے تذکروں میں مختلف مضامین کی ان کتابوں کا حوالہ ملتا ہے جو ان کے زیر درس رہی تھیں یا جن کا وہ درس دیتے تھے صرف بعض مدارس کی نسبت ان مضامین کی صراحت ملتی ہے جو ان میں پڑھائے جاتے تھے یا جن کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ درحقیقت انہی بکھری ہوئی معلومات کی روشنی میں اس عہد کے نصاب تعلیم کے بارے میں کوئی رائے ظاہر کی جا سکتی ہے۔ دستیاب معلومات کی بنیاد پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عہد وسطیٰ کا نصاب تعلیم علوم نقلیہ و عقلیہ کا جامع تھا یا موجودہ دور کی اصطلاح میں اسلامی و عصری دونوں قسم کے علوم داخلِ نصاب تھے۔ اس لئے کہ

Marfat.com

اعلیٰ تعلیم کے مرحلہ میں جن مضامین کی کتابوں کے پڑھائے جانے کا ذکر ملتا ہے وہ ہیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ ادب علم معانی و بلاغت، منطق و فلسفہ، علم کلام و تصوف، ہیئت و ریاضی اور کیمیا وطب وغیرہ لیکن تفصیلات کی کمی یا واضح ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے یہ کہنا مشکل ہے کہ اس زمانہ کے تمام مدارس میں ان سب مضامین کی تعلیم کا اہتمام تھا۔ بہر حال تاریخی کتب و تذکروں میں عہد سلطنت کے علماء، صوفیاء و ادباء کی تعلیمی زندگی کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مدارس میں ایک عام سطح تک مختلف علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی تھی اور پھر ہر فن کی اختصاصی تعلیم کے لئے اس کے ماہرین سے انفرادی طور پر کسب فیض یا تدریس کے انفرادی مراکز سے رجوع کرنے کا طریقہ رائج تھا۔

عہد سلطنت کے مدارس میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا مدرسہ فیروز شاہی مختلف اعتبار سے منفرد و ممتاز ہے۔ اول یہ کہ یہ پورے طور پر اقامتی ادارہ تھا جس کا تصور اس زمانہ میں کم ہی پایا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کے اساتذہ میں بیرونی علماء و فضلاء بھی شامل تھے۔ تیسرے یہ کہ اس کے نصاب میں علوم نقلیہ و عقلیہ دونوں کی درسیات داخل تھیں، چوتھے یہ کہ اس میں تعلیم کے ساتھ تربیت کا بھی اہتمام تھا، پانچویں یہ کہ اس کی عمارت دو منزلہ، وسیع و کشادہ تھی اور فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی تھی۔ اس میں اساتذہ و طلبہ کے لئے علیحدہ رہائشی کمرے تھے جو پوری طرح مزین تھے۔ چھٹے یہ کہ آس پاس کے علاقوں پر اس کے بڑے گہرے علمی و دینی اثرات مترتب ہوئے۔ ساتویں یہ کہ اس مدرسہ کے بارے میں معاصر و غیر معاصر مآخذ میں کافی تفصیلات دستیاب ہیں۔ انہی وجوہ سے ذیل میں اس مدرسہ کا خصوصی مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس سے اس دور کے مدارس کی نوعیت، ان کے طرز تدریس اور دارالاقامہ کے نظم کو سمجھنے میں مدد ملے گی یہاں یہ وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ استاد گرامی پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب مرحوم نے اپنی انگریزی کتاب Studies in Medieval Indian History and Culture کے چھٹے باب میں A Medieval

Marfat.com

Indian Madrasa کے عنوان سے مدرسہ فیروز شاہی کا تفصیلی تعارف کرایا ہے۶۰۔ اس مدرسہ کے بارے میں میری معلومات خاص طور سے اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

سلطان فیروز شاہ تغلق دینی رجحان، نفاذِ شریعت میں دلچسپی اور رفاہ عام کے کاموں کے لئے کافی مشہور ہیں۔ مختلف قسم کی نئی عمارتیں (مساجد، مدارس، مقبرے، قلعے، سرائیں) بنوانے کے علاوہ سلطان نے دہلی کی قدیم عمارتوں کی مرمت، توسیع و تجدید کاری میں حد درجہ دلچسپی دکھائی حتی کہ قدیم ہندوستان کے بعض آثار قدیمہ کے تحفظ میں بھی سلطان نے بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۶۱۔ ۱۲۹۶ء میں سلطان علاء الدین خلجی کا تعمیر کردہ وسیع و عریض حوض (معروف بہ حوض علائی) بعد میں مٹی سے بھر گیا تھا اور اس کا پانی بھی خشک ہو گیا تھا۔ فیروز شاہ نے اپنے عہد میں اس کی صفائی و مرمت کرائی اور بعض مورخین کے بقول اسی کا نام ''حوض خاص'' پڑ گیا۔ اسی حوض کے کنارے ۱۳۵۲ء میں سلطان نے وہ مدرسہ تعمیر کرایا جو مدرسہ فیروز شاہی کے نام سے موسوم ہو کر اس دور کا سب سے عظیم الشان و مشہور مدرسہ بن گیا۶۲۔ معاصر مورخین کے بیان کے مطابق مدرسہ کی دو منزلہ عمارت فن تعمیر کا بہترین نمونہ تھی۔ یہ بلند ستونوں پر قایم تھی اور اس پر متعدد قبے بنے ہوئے تھے۔ اس مدرسہ کا محل وقوع بہت عمدہ تھا اور یہ ایک وسیع میدان میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی مختلف عمارتوں کے درمیان کشادہ صحن تھے اور اس کی گذرگاہیں وسیع تھیں۔ محراب نما دالانوں، حوض کی جانب کھلتی ہوئی کھڑکیوں اور آس پاس رنگ برنگ کے پھولوں سے بھری کیاریوں نے اس کی خوبصورتی و جاذبیت اور ماحول کی خوشگواری میں اور اضافہ کر دیا تھا، ضیاء الدین برنی کے الفاظ میں:

> ''از بناہائے مبارک خداوند عالم مدرسہ فیروز شاہی است کہ بس بوالعجب عمارتی بر سر حوض علائی بنا شدہ است و عمارت مدرسہ مذکور از رفعت گنبد ہا و شیرینی عمارتہا و موازین صحنہا و لطافت نشست جایہائے و محابائے مروج و صفہائے دلآویز گوی

لطافت از عمارتہای کہ در عالم معروف است ربودہ است......
از شیرینی عمارت وموازین عمارت وہوای دلکشای ازاں بناہا
نادرہ است'' ۶۳۔

مشہور معاصر شاعر مطہر کڑہ ۶۴ نے اس کی منظرکشی ان اشعار میں کی ہے:

صحنِ اُو روح فزا ساحت اوجاں پرور
خاک اومشک فشاں نکہت اورعنبر بار
سبزہ وسنبل وریحان وگل ولالہ درو
رستہ وآراستہ چندانکہ کند چشم تو کار ۶۵

مدرسہ میں متعدد لکچر ہال کے علاوہ طلبہ کے لئے دارالاقامہ اوراساتذہ کے لئے علیحدہ رہائش گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ مہمانوں کے قیام کا معقول نظم تھا اور عام زائرین کی خاطر تواضع کا بھی اہتمام تھا۔ مسجد کے احاطہ میں ایک عظیم مسجد بنی ہوئی تھی جس میں امام وموذن کے لئے الگ الگ کمرے اور ذکر ومراقبہ میں مشغول رہنے والوں کے لئے حجرے بھی تھے ۶۶۔ مزید براں شیراز، یمن ودمشق میں بنی ہوئی قالینوں وفرشوں سے مدرسہ کا اندرونی وبیرونی حصہ پوری طرح مزین تھا، معاصر شاعر کے الفاظ میں :

وزبساط یمن مفرش شیراز و دمشق
ہمہ آراستہ بیروں ودرونش چونگار ۶۷

تعمیراتی محاسن اورظاہری آرائش وزیبائش کے علاوہ یہ مدرسہ ایسے باصلاحیت وتجربہ کاراساتذہ کے لئے بھی مشہور تھا جو اپنے اپنے فن میں منفرد وممتاز تھے ۶۸۔ ان میں سب سے ممتاز مولانا جلال الدین رومی تھے (یہ مشہور فلسفی وصاحب مثنوی مولانا جلال الدین رومی متوفی ۱۲۷۳ء کے علاوہ ہیں) برنی نے انکے لئے ''استاد متفنن'' کا لقب استعمال کیا ہے ۶۹۔ لیکن مطہر کڑہ کے بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس مدرسہ کے پرنسپل یا صدر مدرس تھے۔

Marfat.com

صدر آن محفل و سردفتر ان استادی — کہ زسر تا بقدم صورت عقل ست و وقار
گفتم ایں عالم آفاق جلال الدین است — کہ رومی آن کز نسبتش رے کند و روم فخار[۲]

معاصر شاعر نے انہیں علم قرآن، حدیث وفقہ کا ماہر قرار دیا ہے اور خود ان سے مستفید ہونے کی صراحت بھی کی ہے:

راوی ہفت قراءت سند چاردہ علم — شارح پنج سنن مفتی مذہب چار
پس شنیدم زگفتارش انواع علوم — اخذ کردیم زتفسیر واصول واخبار[۲]

یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ سرسید احمد خاں اور بعض دوسرے جدید مصنفین[۳] نے حوض علائی کے کنارے قایم شدہ مدرسہ فیروز شاہی کے سب سے بڑے مدرس یا صدر مدرس کے حیثیت سے سید یوسف بن جمال حسینی (م ۱۳۸۸ء) کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی صراحت کی ہے کہ وہ اسی مدرسہ کے صحن میں مدفون ہیں، جبکہ بعض نے دونوں (مولانا جلال الدین رومی اور سید یوسف بن جمال) کو اس کے بڑے مدرسین میں شامل کیا ہے[۴]۔ دوسری جانب بعض اہل قلم نے سید یوسف بن جمال کو اس مدرسہ کا صدر مدرس بتایا ہے جو حوض خاص کے قریب تعمیر کیا گیا تھا اور یہ بھی صراحت کی ہے کہ یہ مشہور مدرسہ فیروز شاہی کے علاوہ تھا[۵]۔

مدرسہ فیروز شاہی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس کے نصاب یا درسیات میں علوم نقلیہ وعقلیہ دونوں قسم کے مضامین شامل تھے۔ بعض معاصر ماخذ میں یہ تفصیل بھی ملتی ہے کہ عہدِ فیروز شاہی کے مشہور مدارس میں تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، ادب، علمِ معانی وبلاغت منطق وفلسفہ، علمِ کلام وتصوف، ہیئت و ریاضی، علم نظر (مناظر)، علم طبیعی، علمِ الٰہیات، علمِ طب وخطاطی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ سیرت فیروز شاہی کی متعلقہ عبارت ملاحظہ ہو:

''وہم از شمائل حمیدہ اشاعتِ علم است واقامتِ مدارس علوم از علم فقہ وقراءت واصولِ فقہ واصولِ کلام وتفسیر واحادیث ومعانی وبیان ونحو وصرف، علم نظر، علم ریاضی وعلمِ طب وتحریر وخط بتعیین وظائف ونفقاتِ مستمرہ فرمود تا بفراغ خاطر در تعلیم

وتعلم حد فراواں واجب بینند" ۶ ے

یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس دور کے مشہور مورخ ضیاء الدین برنی نے مدرسہ فیروز شاہی میں پڑھائے جانے والے مضامین میں صرف تفسیر حدیث وفقہ کا ذکر کیا ہے ۷ ے۔ غالباً ان مضامین کی بنیادی اہمیت کی وجہ سے صرف انہی کی صراحت پر اکتفاء کیا ہے۔ بہرحال ان تفصیلات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ عہد سلطنت کے بڑے بڑے مدارس میں آجکل کی اصطلاح میں اسلامی علوم کے ساتھ عقلی وسائنسی علوم کے مضامین کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔

معاصر مآخذ سے یہ اہم حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ مدرسہ فیروز شاہی میں درس وتدریس کے علاوہ بحث ومباحثہ کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا اور طلبہ کو مختلف مسائل پر بحث کرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے بیان کے مطابق عہد وسطیٰ کے تعلیمی اداروں میں مباحثہ پر خاص زور دیا جاتا تھا اور اس کا مقصد طلبہ کی ذہنی صلاحیت کو جلا دینا اور ان کی قوت استدلال کو مضبوط کرنا ہوتا تھا۔ ۸ ے مدرسہ فیروز شاہی میں اس روایت کے فروغ پانے کے بارے میں انھوں نے مطہر کا یہ شعر بطور ثبوت نقل کیا ہے :

ہم چناں یک دگر از طالب علماں ہر سوی
بر فلک بردہ صدا غلغل بحث وتکرار ۹ ے

مدرسہ میں طلبہ کے لئے کسی یونیفارم کا ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ اساتذہ کے سلسلہ میں بعض ماخذ میں یہ مذکور ہے کہ وہ شامی جبہ اور مصری دستار استعمال کرتے تھے ۱۰ ے۔ جہاں تک دارالاقامہ کے نظم کا تعلق ہے مورخین نے اسے مثالی قرار دیا ہے، رہن سہن وخورد ونوش ہر اعتبار سے اس کے حسن انتظام کی تعریف کی ہے۔ مدرسہ میں رہنے والوں کے لئے کھانے پینے کے نظم کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا معیار بہت بلند تھا۔ ماکولات میں مرغ وماہی، بھنا ہوا گوشت، نرم نرم روٹیاں، بریانی اور مختلف قسم کی مٹھائیاں ہوتی تھیں۔ مشروبات میں شربت انار کا

خصوصی ذکر ملتا ہے۔ مزید براں کھانے کے بعد سونے چاندی کی طشتری میں پان پیش کرنے کا اہتمام بھی ہوتا تھا ۸۱۔

مدرسہ فیروز شاہی پوری طرح حکومت کے زیر انتظام تھا اور اس کے اخراجات شاہی حکومت کے وسائل سے پورے کیے جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ اس میں ہر چیز اسی پیمانہ پر مہیا ہوتی تھی۔ اساتذہ و دیگر عملہ کو مشاہرے اور طلبہ کو وظائف دینے کا معیار بلند تھا۔ وہ فیس وغیرہ کے بارے بالکل آزاد تھے۔ برنی نے یہاں تک لکھا ہے کہ اس مدرسہ کے عام زائرین اور عارضی مقیمین بھی سلطان کی جانب سے انعامات وعطیات سے محظوظ ہوتے تھے اور اس کے مکینوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو شاہی لطف وکرم سے محروم رہا ہو ۸۲۔

ان سب باتوں کے علاوہ مدرسہ کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اس میں تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی ماحول بھی پایا جاتا تھا۔ اس کے مکینوں میں بہت سے علماء، حفاظ، قراء، صوفیاء وعباد بھی شامل تھے جو دارالاقامہ کے حجروں میں قیام فرماتے تھے۔ حفاظ وقراء اپنی قراءت سے فضا کو مسحور کرتے تھے۔ فرائض کے علاوہ یہاں نوافل کا بھی اہتمام ہوتا تھا۔ خاص طور سے صوفیاء حمد وثناء، ذکر وفکر، نفل عبادات اور دعاؤں میں مسلسل مصروف رہتے تھے۔ واردین وصادرین اللہ اللہ کی صدائیں بلند کرتے تھے اور بادشاہِ اسلام وعام مسلمانوں کے حق میں دعائیں کرتے تھے۔ بقول ضیاء الدین برنی جو بھی مدرسہ کے احاطہ میں داخل ہوتا ایک خاص سکون وقلبی راحت محسوس کرتا اور اس کے دل سے سلطان کے لئے دعائیں نکلتیں ۸۳۔ معاصر مؤرخ نے اپنا یہ مزید تاثر بیان کیا ہے کہ سابق سلاطین کے زمانہ میں دہلی میں بہت سی عمارتیں تعمیر ہوئیں اور ان پر کثیر وسائل صرف کیے گئے لیکن جو رعنائی وزیبائی مدرسہ فیروز شاہی کی عمارت میں نظر آتی ہے اور جو راحت وسکون اس مدرسہ میں آکر نصیب ہوتا ہے وہ کسی اور جگہ محسوس نہیں ہوتا۔ خود مؤرخ کے الفاظ میں "واگرچہ در دارالملک دہلی بادشاہان گذشتہ طاب ثراہم عمارتہا بسیار کردہ اند و مالہائے بے اندازہ دراں خرچ

Marfat.com

شدہ و مواطن دیوان و پریاں گشتہ اما شیرینی، روحی وراحتی کی مدرسہ فیروز شاہی دارد ہیچ بنائے نیست و بدین زیبائی عمارتی مشاہدہ نشدہ است۔

نباشد ایں چنیں زیبا بنائے وگر باشد چنیں زیبا نباشد ۸۴

مدرسہ فیروز شاہی انہی خصوصیات (اعلیٰ تعلیمی معیار، دارالاقامہ کی سہولیات، خورد و نوش کے عمدہ نظم اور علمی و دینی ماحول) کی بدولت کافی مشہور ہوگیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شائقین علم ملک کے مختلف حصوں سے اس سے مستفیض ہونے کے لئے آتے تھے اور عام لوگ بھی اس کے نظارہ کے لئے بہ کثرت اس کا رخ کرتے تھے ۸۵۔ ان سب کے علاوہ مدرسہ کے فیض سے آس پاس کے علاقوں میں ایسی چہل پہل ہوگئی تھی اور علمی و دینی ماحول پیدا ہوگیا تھا کہ شہر کے مختلف حصوں سے لوگ منتقل ہوکر مدرسہ کے قریب سکونت اختیار کرنا پسند کرنے لگے تھے جیسا کہ برنی کے ان الفاظ سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ "مقیمان شہراز شیفتگی ہوائی جان ربائی مدرسہ اوطان قدیم را ترک می آرند و در جوار مدرسہ خانہا می سازند" ۸۶۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ عہد سلطنت میں مدارس کا قیام اس کے ابتدائی حصہ سے ہی شروع ہوا اور بعد کے دور میں اس کا سلسلہ اور وسیع اور مضبوط ہوتا گیا۔ ان تعلیمی اداروں کی توسیع و ترقی عہد اسلامی کی علمی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اس میں سلاطین و معاصر علماء کبھی کی توجہ کارفرما رہی ہے۔ دوسرے مذکورہ مباحث سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ان مدارس کے ذریعہ جن علوم کی اشاعت ہوئی ان کا دائرہ کافی وسیع تھا اور موجودہ اصطلاح میں انہیں اسلامی و عصری علوم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مدارس کے قیام و انصرام میں سلاطین دہلی نے جس گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا اس سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف تعلیم کی اشاعت پر توجہ دیتے تھے بلکہ اسے اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ نئے مفتوحہ علاقوں میں تعلیم کے اہتمام اور غلاموں و فوجیوں کی تعلیم و تربیت کا نظم قائم کرنے سے یقینی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ مختلف طبقہ کے لوگوں میں تعلیم کی اشاعت کے خواہاں تھے۔ مزید براں بعض

Marfat.com

اقامتی مدارس کی کارکردگی کی جو تفصیلات سامنے آئیں ان سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ اس سرزمین میں اقامتی اداروں کی تاریخ بڑی قدیم ہے۔ اہم بات یہ کہ اس عہد کے بعض اقامتی مدارس میں درس و تدریس، رہائش اور کھانے پینے کا جو نظم جاری ہوا وہ ہر اعتبار سے معیاری تھا۔ اس سے یہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ سلاطین یا بادشاہوں نے صرف شاہی محلات، قلعہ جات اور دوسری سرکاری عمارتوں میں شاہی انداز اختیار نہیں کیا بلکہ دین کے قلعوں کی تعمیر و تنظیم میں بھی شاہی معیار برقرار رکھا۔ اس سے ان کی نظر میں مدارس کی اہمیت و وقعت واضح ہوتی ہے۔ ان تمام باتوں سے بعض جدید مؤرخین کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ عہدِ زیر بحث میں ریاست کو تعلیم کے اہتمام سے کوئی مطلب نہیں تھا[۸] اور یہ عام تاثر بھی غلط ثابت ہوتا ہے کہ بادشاہ ریاست کے وسائل صرف محلات و تاریخی عمارتیں بنوانے اور اپنے و شاہی خاندان کے عیش و آرام میں صرف کرتے تھے۔

☆☆☆

حواشی و مرجع

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: قاضی اطہر مبارک پوری، خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظام تعلیم و تربیت، دیوبند، ۱۹۹۵ء، ص ۲۳۔۵۰، محمد حمید اللہ، عہد نبوی کا نظام تعلیم، نقوش رسول نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۸۳ء، ۴/ ۱۱۵۔۱۲۷

۲۔ علامہ شبلی نعمانی، مقالات شبلی (مرتبہ سید سلیمان ندوی) مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۵۵ء، ۳/ ۴۶۔۴۷، ضیاء الحسن فاروقی، مسلمانوں کا تعلیمی نظام، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۹۲ء ص ۴۵۔۵۹

۳۔ سید ابوظفر ندوی، تاریخ سندھ، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۷۰ء، ص ۳۶۹۔۳۷۸، قاضی اطہر مبارک پوری، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۷ء، ص ۱۵۳۔۱۶۸، ۲۵۱۔۲۵۳

۴- Muhammad Nazim, *The Life and Times of Sultan*

Marfat.com

Mahmud of Ghazna, New Delhi,1971,PP.157-158

ایڈورڈ۔ سی۔ سخاؤ، البیرونی کا ہندوستان (اُردو ترجمہ: عبدالحیٔ/ مقدمہ وحواشی: قیام الدین احمد) نئی دہلی، ۱۹۹۳ء، ص۱۲ (دیباچہ)

۵۔ محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ، تاریخ فرشتہ، نول کشور (بدون تاریخ) ۱/ ۳۰

۶۔ حسن نظامی، تاج المآثر، نقل نمبر ۹۵ (مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری نمبر ۲۰۹، برٹش میوزیم نمبر ۷۶۲۳) ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱/ ۶، ابوالحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، دارالمصنفین، اعظم گڈھ، ۱۹۷۱ء، ص۱۹۔۲۰

۷۔ احمد بن علی القلقشندی، صبح الاعشیٰ، القاہرہ، ۱۹۱۵ء، ۵/ ۶۹

۸۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیں: سعید احمد رفیق، اسلامی نظام تعلیم، ادارہ تصنیف وتالیف، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی (بدون تاریخ) ص۱۵۔۳۶

۹۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص۱۴

۱۰۔ فخر مدبر، تاریخ فخر الدین مبارک شاہ (تاریخ فخر مدبر) بہ تصحیح ای ڈینی سن راس، لندن ۱۹۲۷ء، ص۲۶

۱۱۔ فتوحات فیروز شاہی (تصحیح پروفیسر عبدالرشید) علی گڑھ، ۱۹۵۴ء، ص۱۳، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص۲۰

۱۲۔ سید عبدالحیٔ الحسنی، ہندوستان اسلامی عہد میں (اُردو ترجمہ "جنة المشرق و مطلع النور المشرق" از شمس تبریز خاں) مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ۱۹۷۳ء ص۱۵۸

۱۳۔ اسلامی نظام تعلیم، ص۴۳، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص۳۵

۱۴۔ ہندوستان اسلامی عہد میں، ص۱۵۸۔۱۵۹

۱۵۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص۲۱

۱۶۔ منہاج السراج، طبقات ناصری، کالج پریس، کلکتہ، ۱۸۶۴ء، ص۱۴۴

۱۷۔ اسلامی نظام تعلیم بحوالہ بالا، ص۱۲۶، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص۴۳

۱۸۔ تاریخ فرشتہ، ص۴۰۸، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص۷۳۔۷۴

۱۹۔ ہندوستان اسلامی عہد میں، ص۱۵۴۔۱۵۵

Marfat.com

۲۰۔ طبقات ناصری، محولہ بالا، ص ۱۸۹

۲۱۔ اسلامی نظام تعلیم، ص ۷۵

۲۲۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص ۲۱

۲۳۔ طبقات ناصری، ص ۱۸۸

۲۴۔ طبقات ناصری، ص ۲۱۰، ایس، ایم۔ جعفر/ اُردو ترجمہ: سعید انصاری، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۳۵

۲۵۔ M.H.G. Raverty, *Tabakat-E-Nasiri*(Eng.Tr. of *Tabaqat-E- Nasiri* of Minhaj al-Siraj),New Dehi, .1970,I/679

۲۶۔ طبقات ناصری، ص ۲۱۰

۲۷۔ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۶۰ء، ص ۱۰۳، عصامی، فتوح السلاطین، مدراس، ۱۹۴۸ء، ص ۱۵۶، نظام الدین احمد، طبقات اکبری، کلکتہ، ۱۹۱۱ء، ۱/ ۷۲-۷۳، تاریخ فرشتہ، ۱/ ۷۵، ۷۶

۲۸۔ ضیاء الدین برنی، ص ۶۷-۶۹، تاریخ فرشتہ ۱/ ۷۵، ۷۸-۷۹، اسلامی نظام تعلیم، محولہ بالا، ص ۷۶-۷۸

۲۹۔ تاریخ فرشتہ، ۱/ ۹۳، اسلامی نظام تعلیم، ص ۷۹ (موخر الذکر کتاب میں غلطی سے ان کا نام سعید ملّا لکھا ہوا ہے) Narendra Nath law, *Promotion of Learning in India during Muhammadn Rule*,Delhi, 1973.PP.28,32

۳۰۔ برنی، ص ۱۹۸، تاریخ فرشتہ، ۱/ ۹۰، اسلامی نظام تعلیم، ص ۷۹-۸۰

۳۱۔ برنی، ص ۳۵۳-۳۵۴

۳۲۔ تاریخ فرشتہ، ۱/ ۱۲۱-۱۲۲، این۔ این لا، ص ۳۶، ۳۹

۳۳۔ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۲۲۶-۲۲۸

۳۴۔ سر سید احمد خان، آثار الصنادید، سنٹرل بک ڈپو، دہلی، ۱۹۶۵ء، ص ۴۰۸، ۴۴۹، جدید

Marfat.com

ایڈیشن (تین جلدیں/مرتبہ خلیق انجم) اُردو اکادمی دلی، نئی دہلی ۱۹۹۰ء، ۳/ ۱۶۵

۳۵ برنی، ص ۳۸۲، این۔ این۔ لا محولہ بالا، ص ۴۱

۳۶ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص ۲۱، آثار الصنادید، ۱/ ۳۲۰

۳۷ برنی، ص ۴۳۵

۳۸ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، محولہ بالا، ص ۳۹۔۴۰

۳۹ شہاب الدین العمری، مسالک الابصار (اُردو ترجمہ مع عربی متن): خورشید احمد فارق (بعنوان تاریخ ہند پر نئی روشنی عربی کی ایک قلمی کتاب سے) ندوۃ المصنفین، دہلی (بدون تاریخ) ص ۴۵

۴۰ بدرالدین چاچی، قصائد بدر چاچ، نول کشور، کانپور، ۱۸۷۷ء، ص ۹۰

۴۱ ملاحظہ فرمائیں راقم کی کتاب: اسلامی قوانین کی ترویج وتنفیذ عہد فیروز شاہی کے ہندوستان میں، ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء

۴۲ سیرت فیروز شاہی، ص ۱۴۷۔۱۴۸، فتوحات فیروز شاہی، ص ۱۱، ۱۳، ۱۴، ۱۵

۴۳ طبقات اکبری، ۱/ ۲۴۱، تاریخ فرشتہ، ۱/ ۱۵۱، عبدالباقی نہاوندی، مآثر رحیمی، کلکتہ ۱۹۲۴، ۱/ ۳۸۰

۴۴ آثار الصنادید، ص ۲۰۳۔۲۰۴، ہندوستان اسلامی عہد میں، ص ۱۵۹

۴۵ برنی، ص ۵۶۴، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص ۲۳

۴۶ شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۹۱ء، ص ۲۷۰۔۲۷۱، این۔ این۔ لا، ص ۵۴۔۵۵

۴۷ این۔ این۔ لا، ص ۷۱، اسلامی نظام تعلیم، ص ۹۸۔۹۹

۴۸ رزق اللہ مشتاقی، واقعات مشتاقی، روٹوگراف نمبر ۳ (مخطوطہ برٹش میوزیم، لندن) ریسرچ لائبریری شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، اوراق ۶ الف۔ ۶ ب، مآثر رحیمی ۱/ ۴۳۸، تاریخ فرشتہ، ۱/ ۱۷۶۔ Iqtidar Husain Siddiqui, "Islamic Learning and Intellectual Thought of the Sultanate of Delhi During the Lodi Period," *Hamdard Islamicus* Vol., 10/3, Autumn, 1987, PP 58-59

Marfat.com

۴۹ این۔این۔لا، ص ۲۷۔۳۷، تعلیم مسلمان کے عہد حکومت میں، ص ۴۴

۵۰ عبدالمجید مسالک، مسلم ثقافت ہندوستان میں، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، طبع دوم (بدون تاریخ)، ص ۱۹۷، اسلامی نظام تعلیم، ص ۹۹۔۱۰۰

۵۱ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، کلکتہ، ۱۸۶۸ء، ۱/۳۲۳۔۳۲۴، اقتدار حسین صدیقی، محولہ بالا، ص ۴۷

۵۲ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۳۲ھ، ص ۲۵۲، محمد اسحاق / اُردو ترجمہ: شاہد حسین رزاقی، علم حدیث میں برعظیم پاک و ہند کا حصہ، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۱۲۴۔۱۲۵، ہندوستان اسلامی عہد میں، ص ۱۶۶

۵۳ تاریخ فرشتہ، ۱/۱۸۶

۵۴ اسلامی نظام تعلیم، ص ۱۰۰۔۱۰۱، اقتدار حسین صدیقی، محولہ بالا انگریزی مضمون، ص ۶۱۔۶۲

۵۵ تاریخ فرشتہ، ۱/۱۸۷، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص ۵۸

۵۶ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۴۵۷۔۴۶۰

۵۷ این۔این۔لا، ص ۱۳۶۔۱۳۷، اسلامی نظام تعلیم، ص ۱۰۲۔۱۰۳

۵۸ سید عبدالحئی الحسنی، نزہۃ الخواطر، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۵۴ء، ۴/۳۷۸، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص ۳۰

۵۹ اس کی تفصیلات آئندہ باب میں ملاحظہ فرمائیں۔

۶۰ **Khaliq Amad Nizami**, *Studies In Medieval Indian History and Culture*, Kitab Mahal, Allahabad, 1966, PP.73-79

۶۱ سیرت فیروز شاہی، ص ۱۸۴۔۱۸۸، عفیف، ص ۳۰۵۔۳۱۵، ظفر الاسلام اصلاحی، اسلامی قوانین کی ترویج و تنفیذ۔ عہد فیروز شاہی کے ہندوستان میں، محولہ بالا (باب چہارم۔ ہندوؤں کے ساتھ فیروز شاہ تغلق کا برتاؤ۔ معترضین کے خیالات کے ناقدانہ جائزہ) ص ۱۰۵۔۱۰۷۔ J.M. Banerjee, History of Firuz Shah Tughlaq, Delhi, 1967, PP. 186-187

Marfat.com

۶۲۔ برنی، ص ۵۶۲۔ معاصر مورخ نے اس کی تاریخ تعمیر سے خاموشی اختیار کی ہے
پروفیسر خلیق احمد نظامی (محولہ بالا، انگریزی کتاب ص ۷۳) نے اس کی تاریخ بنا
۷۵۳ھ/۱۳۵۲ء ذکر کی ہے جبکہ سرسید احمد خاں (آثار الصنادید، ۱/ ۳۱۹۔۳۲۰)
نے اسے تخمیناً ۷۵۵ھ/۱۳۵۴ء بتایا ہے۔

۶۳۔ برنی، ص ۵۶۲۔۵۶۳

۶۴۔ مطہر کڑہ کے حالات کے لئے ملاحظہ فرمائیں: اخبار الاخیار، ص ۸۵۔۸۶، نزہۃ الخواطر ۲/ ۱۷۰، حبیب الرحمٰن خاں شروانی، قصائد مطہر، معارف، ۳۶/۱، جولائی ۱۹۳۵ء، ص ۴۲۔۴۷، محمد شفیع، مطہر کڑہ، اورینٹل کالج میگزین (لاہور) ۱۱/۳ مئی ۱۹۳۵ء، ص ۱۰۷۔۱۱۶

۶۵۔ ڈاکٹر وحید مرزا، دیوان مطہر کڑہ، اورینٹل کالج میگزین ۱۱/۳، مئی، ۱۹۳۵ء، ص ۱۳۶

۶۶۔ برنی، ص ۵۶۳۔۵۶۴۔ خلیق احمد نظامی محولہ بالا انگریزی کتاب، ص ۷۵

۶۷۔ دیوان مطہر کڑہ محولہ بالا، ص ۱۳۷

۶۸۔ دیوان مطہر کڑہ، ص ۱۳۷۔۱۳۸

۶۹۔ برنی، ص ۵۶۴

۷۰۔ دیوان مطہر کڑہ، ص ۱۳۷

۷۱۔ دیوان مطہر کڑہ، ص ۱۳۷

۷۲۔ آثار الصنادید، ۱/ ۳۱۹۔۳۲۰

۷۳۔ ہندوستان اسلامی عہد میں، ص ۱۵۹

۷۴۔ نزہۃ الخواطر، ۲/ ۱۷۸

۷۵۔ اخبار الاخیار، ص ۱۵۰، سعید احمد، اسلامی نظام تعلیم، ص ۹۳

۷۶۔ سیرت فیروز شاہی، نقل نمبر ۱۱۱ (مخطوطہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ) مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، یونیورسٹی کلکشن، ص ۱۴۷

۷۷۔ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۵۶۴

۷۸۔ خلیق احمد نظامی، ص ۷۷

۷۹۔ دیوان مطہر کڑہ، ص ۱۳۷

Marfat.com

۸۰ دیوان مطہر کڑہ، ص ۱۳۷

۸۱ دیوان مطہر کڑہ، ص ۱۳۸، خلیق احمد نظامی، ص ۷۷۔۷۸

۸۲ برنی، ص ۵۶۳۔۵۶۴، سیرت فیروز شاہی، ص ۱۳۸، خلیق احمد نظامی، ص ۷۸۔۷۹

۸۳ برنی، ص ۵۶۴

۸۴ برنی ص ۵۶۵

۸۵ سیرت فیروز شاہی، ص ۱۳۸، خلیق احمد نظامی، ص ۵۶

۸۶ برنی، ص ۵۶۳

۸۷ Krishnalal Ray , *Education in Medieval India*, Delhi, 1984, P.9

Marfat.com

باب دوم

اعلیٰ تعلیم کے ذرائع عہد اسلامی کے ہندوستان میں

عہد اسلامی کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے ذرائع میں عام طور پر سب سے زیادہ معروف واہم ذریعہ مدرسہ کو سمجھا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس عہد کے مسلم حکمرانوں نے مدارس کے قیام وانصرام میں کافی دلچسپی لی۔ یہ سلسلہ دہلی سلطنت کے اولین دور سے شروع ہوا تو اس کے استحکام وترقی کے ساتھ وسیع ہوتا چلا گیا۔ اس میں سلاطین کی ذاتی توجہ اور معارف پروری کا کافی دخل رہا ہے جیسا کہ پہلے واضح کیا جاچکا ہے۔ واقعہ یہ کہ اس زمانہ میں مدارس کی کثرت اور ان کی کارکردگی بہتر بنانے میں حکومت کی دلچسپی کی مذکورہ مثالوں کے باوجود اعلیٰ تعلیم یا کسی مضمون میں اختصاص کے حصول میں سب سے نمایاں کردار تدریس کے انفرادی مراکز یا علماء کی مجلسوں کا نظر آتا ہے ان کے علاوہ تعلیم کے فروغ اور علم کی اشاعت میں کتب خانوں، علمی مجالس، خانقاہوں اور تجربہ گاہوں کا بھی حصہ رہا ہے۔ عہد سلطنت کے مدارس پر مفصل بحث سابق باب میں گذر چکی ہے۔ اس باب میں تعلیم کے بقیہ ذرائع سے بحث کی جائے گی۔

تدریس کے انفرادی مراکز:

اعلیٰ تعلیم کے ذرائع میں تدریس کے انفرادی مراکز کی اہمیت اس سے واضح ہوتی ہے کہ معاصر علماء وفضلاء کی تعلیمی زندگی کی تفصیلات میں مدارس سے تعلیم حاصل کرنے یا ان سے فراغت پانے کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ بلکہ عام طور پر ان اساتذہ کا ذکر آتا ہے جن سے انھوں نے درسی کتب پڑھیں یا مختلف علوم وفنون حاصل کیے۔ کسی

استاد سے حدیث کا درس لینے کا ذکر ملتا ہے تو کسی سے فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کا اور علوم عقلیہ کے باب میں فیض یاب ہونے کا۔ اسی طرح جو علماء تدریسی خدمات میں مصروف تھے ان کے ضمن میں یہ صراحت کم ملتی ہے کہ وہ فلاں مدرسہ میں استاد تھے بلکہ یہ واضح کرنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ وہ کن کتابوں کی تدریس میں مہارت رکھتے تھے یا کون سے مضامین پڑھاتے تھے یا ان مقامات کا ذکر کیا جاتا ہے جہاں وہ بساطِ تدریس بچھائے ہوئے تھے [۱]۔ ان سب سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ اس عہد میں تعلیم کے اعلیٰ مرحلہ کی تکمیل میں مدارس سے زیادہ اہمیت علماء و اساتذۂ فنون کے انفرادی مراکز کو حاصل تھی۔ جہاں تک مدارس اور تعلیمی اداروں کا تعلق ہے ان میں ایک عام سطح تک مروجہ مضامین کی تعلیم کا اہتمام کیا جاتا تھا جسے زیادہ سے زیادہ دانشمند یا مولوی کی سطح کی تعلیم کہی جا سکتی ہے۔ باقی اس کے آگے بڑھ کر کسی خاص مضمون میں مہارت حاصل کرنے کے لیے اس فن کے اساتذہ سے انفرادی طور پر رجوع کرنے یا ان کے حلقہ درس میں شریک ہونے کا طریقہ زیادہ معروف و مقبول تھا اور یہ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ عہد وسطیٰ میں مسلم ممالک میں عام طور پر یہی طریقہ معمول بہ تھا۔ یہاں صرف ایک مثال دینا کافی ہوگا۔ سولھویں صدی عیسوی کے ایک بدخشانی عالم ملا محمد فاضل نے بدخشاں میں ابتدائی تعلیم کے بعد کابل میں ملا صادق حلوائی سے کسب فیض کیا پھر توران میں ملا مرزا جان شیرازی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور آخر میں لاہور کا سفر کر کے ملا محمد یوسف سے عقلی علوم و فنون کے میدان میں استفادہ کیا اور پھر ہندوستان ہی میں وہ مستقلاً سکونت پذیر ہو گئے [۲]۔ مؤرخین و تذکرہ نگاروں کے بیانات سے عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی بابت بھی یہی ثبوت ملتا ہے کہ اس زمانہ میں طلبہ و شائقین علم کو علوم و فنون کے مختلف میدانوں میں نامور و ممتاز اساتذہ سے مستفیض ہونے کے لیے مختلف مقامات پر جانا پڑتا تھا اور اس راہ میں بیرونی ممالک کے سفر کی صعوبتیں بھی حائل نہیں ہوتی تھیں۔ صاحب ''مآثر الکرام'' نے طالب علم کی اس روایت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ''طلبہ علم خیل

Marfat.com

خیل از شہرے بہ شہرے می روند وہر جا موافقت دست دہد بہ تحصیل مشغول می شوند''۳۔
اسے چند مثالوں سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ عہد سلطنت کے ایک عالم مولانا قاسم دہلوی کے بارے میں یہ مذکور ہے کہ انھوں نے ہدایہ، بزدوی، کشاف ومصابیح کا درس لیا۴۔ یعنی فقہ، اصول فقہ، تفسیر وحدیث کی تعلیم حاصل کی۔ اسی طرح اس عہد کے ایک دوسرے عالم (ابوحفص عمر بن اسحاق غزنوی) کے تذکرہ میں اتنا اور اضافہ ہے کہ انھوں نے ''عوارف المعارف'' بھی پڑھی ۵۔ مزید براں کسی کے بیان میں لغت ومعانی کا ذکر ملتا ہے اور بعض کی تعلیمی زندگی میں عقلی علوم سے بھی دلچسپی نظر آتی ہے ۶۔ معروف چشتی بزرگ اور فقیہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے بارے میں مذکور ہے کہ انھوں نے مولانا عبد الکریم شروانی اور مولانا فخر الدین ہانسوی سے ہدایہ پڑھی۔ مولانا محی الدین کاشانی سے اصول فقہ کا درس لیا اور بعض دوسری کتابوں کے لیے شیخ شمس الدین محمود بن یحییٰ اودھی سے رجوع کیا ۷۔ اس طریقہ درس کی اس سے زیادہ وضاحت ان کے پیر ومرشد شیخ نظام الدین اولیاء کے تذکرہ میں ملتی ہے۔ انھوں نے مولانا علاء الدین اصولی سے فقہ واصول فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ خواجہ شمس الملک سے مقامات حریری (عربی ادب) پڑھی، مولانا کمال الدین زاہد سے مشارق الانوار (حدیث) کا درس لیا۔ تفسیر کشاف کے لیے شیخ فرید الدین اودھی شافعی سے رجوع کیا اور عوارف المعارف (تصوف) کے درس کے لئے شیخ فرید الدین گنج شکر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ۸۔ اسی طرح پندرہویں صدی عیسوی کے ایک گجراتی عالم راجح بن داؤد احمد آبادی کی تعلیمی زندگی کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے کہ انھوں نے محمد بن محمود مقری حنفی سے صرف ونحو اور منطق وعروض کی تعلیم حاصل کی، مخدوم بن برہان الدین سے علم معانی وبیان سیکھا، علم ہیئت وکلام کے میدان میں محمد بن تاج حنفی سے استفادہ کیا اور مکہ مکرمہ جا کر امام سخاوی سے حدیث کا درس لیا ۹۔ خود درس نظامیہ کے بانی ملا نظام الدین (م ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۷ء) کے بارے میں یہ تفصیلات دستیاب ہیں کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم سہالی میں اپنے والد ملا قطب الدین سے حاصل کی اور ان کی وفات کے

Marfat.com

بعد ان کا خاندان جب لکھنؤ منتقل ہوا تو اس وقت ان کی عمر ۱۴ برس تھی اور وہ شرح ملا جامی تک پڑھ چکے تھے۔ یہاں سے قصبہ دیوہ جا کر انھوں نے مولانا عبدالسلام دیوی سے استفادہ کیا اور پھر جائس میں متعدد کتابیں ملا علی قلی سے پڑھیں، معروف روایت کے مطابق انھوں نے آخری مرحلہ کی کتابوں کے لیے مولانا امان اللہ بنارسی سے رجوع کیا ۱۰۔ اور صاحب سبحۃ المرجان کے بیان کے مطابق انھوں نے یہ کتابیں ملا غلام علی نقشبندی سے پڑھیں ۱۱۔ مزید براں بعض کتابوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ انھوں نے ملا نقشبند گورکھپوری سے علم ہیئت کا رسالہ ''توشجیہ'' پڑھا ۱۲ اور سلوک وتصوف کے میدان میں وہ شاہ عبدالرزاق بانسوی سے فیض یاب ہوئے ۱۳۔ اسی ضمن میں یہ وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ درس وتدریس کا یہ طریقہ کسی خاص مضمون تک محدود نہیں تھا بلکہ مختلف علوم وفنون کے باب میں یہی طریقہ اپنایا جاتا تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ وتصوف کے ساتھ عقلی علوم کے میدان میں بھی اختصاص پیدا کرنے کے لیے یہی طریقہ رائج تھا جیسا کہ معاصر علمائے معقولات کی تعلیمی زندگی کی تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے۔

یہاں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ مختلف علوم وفنون کے میدان میں اعلیٰ سطح کی تعلیم کے لئے ہندوستان کے مختلف علاقوں کے علماء سے کسب فیض کے علاوہ دوسرے ملکوں کے اساتذہ سے استفادہ کی روایت بھی اس دور میں قایم تھی۔ خاص طور سے علم حدیث کے تعلق سے اس نوع کی زیادہ مثالیں ملتی ہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں مسلم حکومت کے اولین دور میں بھی حصول علم کے لیے ہندوستانی طلبہ کے بیرونی سفر کی مثالوں کی کمی نہیں ہے لیکن مغل دور میں اس نوع کی مثالیں بہ کثرت دستیاب ہیں۔ عہد سلطنت کے ممتاز محدث شیخ حسن بن محمد صغانی لاہوری (م ۱۲۵۲ء) نے لاہور میں مروجہ درسیات کی تکمیل کے بعد غزنیں، عراق وحجاز کا سفر کیا اور آخرالذکر دونوں مقامات پر خاص طور سے علماء حدیث سے استفادہ کیا۔ انھوں نے حدیث کی مشہور کتاب مشارق الانوار بغداد میں قیام کے دوران مرتب کی۔ گرچہ وہ اس کے بعد

ہندوستان کئی بار آئے اور طویل عرصہ تک یہاں مقیم رہے لیکن آخر عمر میں وہ بغداد ہی میں تھے کہ وہیں ان کا انتقال ہوا ۱۴۔ عہد سلطنت کے ہی ایک دوسرے عالم شیخ محمد بن محمد صغانی (م ۱۳۷۸ء) تھے جو ضیاء الدین الھندی کے لقب سے مشہور تھے۔ حدیث کی تعلیم انھوں نے قاہرہ و حجاز جا کر مکمل کی۔ مدینہ منورہ میں انھوں نے دیگر علماء سے استفادہ کے علاوہ اس وقت کے ممتاز محدث شیخ علی بن قطب حرم سے موطا کا درس لیا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے پہلے مدینہ منورہ اور پھر مکۃ المکرمہ میں درس و افادہ کا سلسلہ قائم رکھا اور ان کی وفات بھی اسی پاک سرزمین میں ہوئی ۱۵۔ اس کے علاوہ اس زمانہ میں ایسے علماء و فضلا بھی تھے جو عرب ممالک کے محدثین سے استفادہ کے بعد ہندوستان واپس ہوئے اور یہیں تدریسی و تصنیفی مشاغل میں مصروف ہو گئے شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (م ۱۲۶۷ء) نے بخارا میں تقریباً ۸ سال اور حجاز میں ۵ سال مقیم رہ کر وہاں کے علماء حدیث سے استفادہ کیا جن میں مدینہ کے مشہور محدث شیخ کمال الدین محمد یمانی بھی شامل تھے ۱۶۔ چودھویں صدی عیسوی کے ہندوستانی عالم شیخ محمود بن یوسف علی الکرانی الھندی نے مکہ کے جن اساتذہ حدیث سے رجوع کیا ان میں رضی الطبری، زین الطبری، جمال المطری اور شیخ خلیل مالکی کا نام ملتا ہے ۱۷۔

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے دوبار حجاز کا سفر کیا اور حج کی ادائیگی کے بعد وہاں کے مشہور علماء حدیث بالخصوص شیخ ابوطاہر کردی مدنی اور شیخ وفد اللہ مکی سے حدیث کی مشہور کتابوں کا درس لیا اور اس فن کی تعلیم کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا ۱۸۔

حدیث کے علاوہ دوسرے علوم کے میدان میں بھی بیرونی علماء سے یہاں کے شائقین علم کے استفادہ کا ثبوت ملتا ہے۔ شیخ ابوحفص عمر بن اسحاق غزنوی (م ۱۳۶۱ء) نے دہلی میں فقہ و دیگر علوم کی تحصیل کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کی اور وہاں قیام کے دوران انھوں نے متعدد علماء کے درس میں شرکت کی اور اس عرصہ میں شیخ خضر و شیخ رباط سدرہ سے عوارف المعارف کا سماع کیا۔ ۱۹ اسی طرح مشہور سہروردی صوفی و عالم مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے تعلیمی مراحل کی تکمیل کے لیے حجاز

Marfat.com

ومصر کا سفر کیا۔ قیام مدینہ کے دوران انھوں نے عفیف عبداللہ مطری سے عوارف المعارف کا درس لیا ۲۰۔ اسی کے ساتھ ساتھ علوم عقلیہ کے میدان میں مہارت کے حصول کے لیے بھی بعض علماء نے دوسرے ملکوں کا سفر کیا اور وہاں کے علماء سے استفادہ کیا۔ ملا عبداللہ تلنبی اور عزیز اللہ تلنبی کے بارے میں یہ معروف ہے کہ وہ علوم عقلیہ کے زبردست ماہر تھے اور انھیں کے توسط سے شمالی ہند میں عقلی علوم کو رواج ملا۔ ان دونوں نے ملتان میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایران کا رخ کیا اور وہاں ماہر معقولات ملا یزدی سے استفادہ کیا۔ ایران سے ملتان واپسی کے بعد ایک بھائی نے دہلی میں اور دوسرے نے سنبھل میں سکونت اختیار کی اور علوم عقلیہ کی ترویج کو اپنا مشغلہ بنایا ۲۱۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستانی علماء کے تعلیمی مراحل کی یہ چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی گئیں۔ ان مثالوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس زمانہ میں عام طور پر مختلف علوم کے لیے مختلف اساتذہ سے رجوع کرنے اور بالخصوص اعلیٰ تعلیم یا کسی فن میں حصولِ اختصاص کے لیے مدارس کے بجائے علماء کے انفرادی مراکز سے فائدہ اٹھانے کا رواج تھا۔ تاہم ایک ہی استاد سے جملہ درسیات کی تکمیل کی بھی کچھ مثالیں ملتی ہیں۔ مولانا قاسم بن عمر دہلوی مصنف ''لطائف التفسیر'' نے ایک ہی استاد (مولانا جلال الدین دہلوی) سے جملہ درسیات (تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ وغیرہ) کی تکمیل کی ۲۲۔ شیخ علاء الدین الندی (م ۷۵ھ/۱۳۷۴ء) نے تمام علوم متداولہ شیخ معین الدین عمرانی سے حاصل کیے۔ البتہ طریقت کی تعلیم وتربیت کے لیے شیخ نصیر الدین چراغ دہلی سے رجوع کیا ۲۳۔ اسی طرح سید جلال بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے اول تا آخر جملہ کتب درسیہ قاضی بہاء الدین اچی سے پڑھیں۔ البتہ تصوف کے میدان میں ان کے خاص استاد عفیف الدین عبداللہ مطری رہے ہیں ۲۴۔ بعد کے زمانہ میں ممتاز عالم ومصنف مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اوّل تا آخر تمام درسی کتب سید محمد طفیل اترولوی سے پڑھیں ۲۵۔ مزید برآں اس عہد کے متعدد علماء کے بارے میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ وہ مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا درس دیتے تھے۔

تعلیم کے انفرادی مراکز کے ذکر میں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ان کے ذریعہ درس وتدریس کے سلسلہ کے رواج پانے کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں تدریسی مشغلہ کو دین کی خدمت اور علم کی اشاعت کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے علماء کے حلقہ میں اس کام میں عام طور سے دلچسپی پائی جاتی تھی۔ اُن میں جو آسودہ وفارغ البال ہوتے تھے وہ پورے سکون واطمینان کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیتے تھے۔ دوسرے ایسے علماء کی بھی کمی نہ تھی جو علمی زندگی میں کسی دوسرے مشغلہ کو اختیار کرنے کے باوجود درس وتدریس کے لئے بھی اپنے اوقات فارغ کر لیتے تھے اور پوری دلچسپی اور لگن کے ساتھ علم کی اشاعت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ تیسرے وہ علماء تھے جنھیں سلاطین وملوک ان کی تدریسی خدمت کے عوض نقدیا آراضی کی صورت میں عطایا سے نوازتے تھے [۲۶] اور وہ بھی پوری دلجمعی سے اس کام میں مصروف رہتے تھے بلکہ بعض اوقات سلاطین خود علماء کو مختلف مقامات پر تدریسی خدمات کے لئے مامور کرتے تھے اور ان کے لیے روز ینے یا وظائف جاری کرتے تھے جیسا کہ ان کے فرامین کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے [۲۷]۔ اس زمانہ کے علماء درس وتدریس سے جو گہرا شغف رکھتے تھے اس کا بخوبی اندازہ انکے حالات زندگی کے مطالعہ سے بھی ہوتا ہے۔ ایک دونہیں سیکڑوں علماء کے تذکرہ میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ وہ تمام عمر درس وتدریس میں مصروف رہے یا ان کا بیشتر وقت درس وتدریس میں بسر ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ اُن سے فیض یاب ہونے والوں کا بیان اس انداز میں ملتا ہے کہ خلق کثیر نے ان سے فائدہ اٹھایا یا بے شمار تشنگان علم نے ان سے سیرابی حاصل کی۔ مزید براں متعدد اساتذہ ایسے گذرے ہیں جو نصف صدی سے زائد عرصہ تک مسند تدریس پر متمکن رہے [۲۸]۔

ان سب کے علاوہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس عہد میں درس وتدریس کے ذریعہ علم کی اشاعت کی روایت اتنی مستحکم تھی کہ بہت سے علمی ذوق رکھنے والے اپنی سرکاری وانتظامی یا دوسری قسم کی مصروفیات کے ساتھ اس کام میں بھی اپنی دلچسپی

Marfat.com

جاری رکھتے تھے۔ شیخ فرید الدین شافعی اودھی سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز تھے۔ اس ذمہ داری کو انجام دینے کے ساتھ وہ بڑی پابندی کے ساتھ تفسیر کا درس بھی دیتے تھے ۲۹۔ انہی کے ہم عصروں میں قاضی عبداللہ بیانوی بیانہ میں قضا کے عہدہ پر مامور تھے اور وہاں وہ درس وتدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھے ہوئے تھے ۳۰۔ عہد بلبن کے ایک اہم افسر حکومت خواجہ شمس الملک سے بھی طلبہ کو درس دینے کی روایت منسوب کی جاتی ہے۔ وہ خاص طور سے عربی ادب کے درس کے لئے معروف تھے ۳۱۔ بہمنی خاندان کے ایک معروف سلطان فیروز شاہ (۱۳۹۷۔۱۴۲۲ء) اپنی سیاسی وانتظامی ذمہ داریوں کو انجام دینے کے ساتھ ہفتہ میں تین روز طلبہ کو درس بھی دیتے تھے ۳۲۔ مآثر الامراء کے مصنف کے بیان کے مطابق عہد اکبری میں لاہور کے گورنر قلیج خاں علوم اسلامیہ کی اشاعت میں کافی دلچسپی رکھتے تھے اور وہ ایک مقامی مدرسہ میں بعض اوقات طلبہ کو تفسیر، حدیث وفقہ کا درس بھی دیتے تھے ۳۳۔ اسی عہد کے مشہور وزیر و ماہر معقولات میر فتح اللہ شیرازی اپنی تدریسی خدمات کے لیے بہت معروف ہیں ۳۴۔

یہاں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ خود اپنی دلچسپی سے یا علم کی خدمت کے طور پر درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کرنے والے یا حکومت کے وظائف وعطایا کے ساتھ اس کام میں مصروف رہنے والے باقاعدہ کسی مدرسہ یا تعلیمی ادارہ کے پابند نہیں ہوتے تھے بلکہ اپنی سہولت وافادۂ عام کے نقطۂ نظر سے کسی بھی مقام پر یہ خدمت انجام دے سکتے تھے۔ کہیں مسجد یا کسی استاد کا اپنا گھر مدرسہ بن جاتا تو کہیں شاہی دربار یا امراء کی حویلی اور ڈیوڑھی میں پڑھنے پڑھانے کا ماحول گرم ہو جاتا، بعض اوقات خانقاہ یا اس سے متصل کسی عمارت میں بھی درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہو جاتا تھا۔ عہد فیروز شاہی کے ایک مشہور عالم و ماہر درسیات مولانا نجم الدین سمرقندی کے درس کا مرکز سلطان کا تعمیر کردہ قصر بالا بند سیری (شاہی محل، دہلی) تھا اور یہی ایک طرح سے ان کا مدرسہ بن گیا تھا جس سے کثیر تعداد میں لوگ مستفید ہوئے ۳۵۔

Marfat.com

مزید براں سلطان سکندر لودی کے ہم عصر و ممتاز محدث سید رفیع الدین صفوی شیرازی (م ۱۵۴۶ء) آگرہ میں ایک مکان میں تقریباً چونتیس برس تک حدیث کا درس دیتے رہے۔ یہ مکان خود سلطان نے ان کے لیے بنوایا تھا اور یہ علم حدیث کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا ۳۶۔ یہاں اس پر اتنا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ حسان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے استاد اور مغلیہ سلطنت کے آخری دور کے ممتاز عالم میر طفیل محمد بلگرامی (م ۱۷۳۷ء) نے ایک طویل عرصہ تک بلگرام میں سید محمد فیض زمیندار کی ڈیوڑھی میں درس و افادہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے بعد تقریباً تمیں سال تک وہ اسی شہر میں میر عبد الجلیل کے دیوان خانہ میں مسند تدریس پر متمکن رہے۔ مولانا آزاد بلگرامی نے انہی مقامات پر ان سے تمام اعلیٰ درسی کتب پڑھیں ۳۷۔ مختصر یہ کہ اس زمانہ کے علماء و فضلاء تدریسی خدمت کے لیے کسی مدرسہ یا ادارہ کی عمارت یا اس میں باقاعدہ اپنی تقرری کی قید و بند سے آزاد ہوتے تھے۔ وہ جس مقام کو درس و تدریس کے لیے منتخب کر لیتے وہی ان کا مدرسہ بن جاتا اور علم کے متوالے کھنچ کھنچ کر اس مقام پر پہنچ جاتے تھے اور ان سے استفادہ کرتے تھے۔ ان سے مستفید ہونے والوں میں مختلف مشاغل، طبقات اور سنین کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ یہ اساتذہ یا ماہرین درسیات کسی ادارہ یا مدرسہ کی نسبت کے بجائے کسی خاص فن یا مضمون میں اپنے تدریسی امتیاز کے لیے معروف ہوتے تھے اور طلبہ یا شائقین علم اپنی دلچسپی کے فن کے اعتبار سے اس فن کے استاد کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ ان تمام تفصیلات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ عہد زیر بحث میں اعلیٰ تعلیم کا سب سے اہم و مقبول ذریعہ علماء کا مرکز تدریس ہوتا تھا، خواہ اس کو ان کے انفرادی مدارس کا نام دیا جائے یا اعلیٰ تعلیمی ادارے سے تعبیر کیا جائے۔

علمی مجالس:

اعلیٰ تعلیم کے فروغ یا مطالعہ و تحقیق کے ذوق کو پروان چڑھانے میں مدارس

Marfat.com

وانفرادی مراکز کے علاوہ علمی محفلوں اور بحث ومباحثہ کی مجلسوں کا بھی حصہ رہا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ اس عہد کے سلاطین وملوک اور بعض امراء بھی علوم وفنون کی اشاعت میں دلچسپی رکھتے تھے اور اہلِ علم وفن کی صحبت کو پسند کرتے تھے۔ اسی لیے ان کا دربار مختلف علوم وفنون کے ماہرین کا مرکز ہوتا تھا۔ ان میں علوم اسلامیہ کے ماہرین شامل ہوتے تھے اور علماءِ معقولات بھی، شعروادب کی محفلیں گرمانے والے یہاں جلوہ افروز ہوتے تھے اور فنونِ لطیفہ کی غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے بھی۔ یہاں نہ صرف یہ کہ انھیں مختلف مسائل پر باہمی تبادلہ خیال کا موقع ملتا تھا بلکہ مختلف علوم وفنون میں دلچسپی رکھنے والوں کی الگ الگ مجلسیں بھی منعقد ہوتی تھی۔ اِن میں آزادانہ ماحول میں بحث ومباحثہ ہوتا تھا اور زیر بحث موضوع سے متعلق شرکاء کی علمی وفنی کاوشیں اور ان کے نتائج فکر سامنے آتے تھے۔ بعض اوقات سلطان یا بادشاہ خود بھی ان میں شریک ہوتا تھا۔ معاصر مورخین کے بیانات سے یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ کسی اہم موضوع پر مباحثہ یا کسی مسئلہ پر شرعی نقطہ نظر سے غور وفکر کے لیے بعض اوقات علماء کی مخصوص میٹنگ طلب کی جاتی تھی اور اس میں شاہی دربار کے علاوہ دارالسلطنت اور آس پاس کے ممتاز علماء کو بھی شرکت کی دعوت دی جاتی تھی اس نوع کے مباحثہ میں کسی نامور عالم یا شیخ کو صدر یا حَکم مقرر کیا جاتا تھا اور وہ اختتامِ مجلس پر اجتماعی غور وفکر کے ماحصل پر اظہار خیال کرتا تھا۔ اس طرح کی علمی مجالس حکومت کے زیر اہتمام منعقد ہوتی تھیں۔ ان میں سے جو مجلسیں خاص طور سے کسی اختلافی مسئلہ یا نازک معاملہ میں سربرآوردہ علماء ومشائخ کی رائے جاننے کے لیے منعقد کی جاتی تھیں وہ اُس وقت کی اصطلاح میں ''محضر'' کہلاتی تھیں ۳۸۔ عہدِ سلطنت میں متعدد بار حکومت کی زیر نگرانی درپیش مسائل پر اجتماعی غور وفکر کے لیے علماءِ وقت کی مجالس کے انعقاد کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں بغاوت کے بعض واقعات ۳۹، سماع کے تئیں شریعت کا نقطۂ نظر، ۴۰ ہندوؤں کے قدیم معابد کا تحفظ ۴۱ برہمنوں پر جزیہ کا نفاذ، ۴۲ شریعت کے مقررہ محاصل کے علاوہ مزید محاصل کی تنفیذ ۴۳، بعض

Marfat.com

مرتد لوگوں اور گمراہ کن فرقوں کے خلاف اقدام[۴۴] جیسے مسائل زیر بحث آئے تھے۔
اس عہد کی علمی مجالس کی نوعیت اور ان کے مباحث کی وسعت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا تھا کہ کبھی کبھی کسی آیت کی تفسیر ہی مذاکرہ کا موضوع بن جاتی تھی۔ "گلزار ابرار" کے بیان کے مطابق بادشاہ اکبر کے معاصر شیخ منور بن عبدالمجید (م ۱۶۰۳ء) تفسیر وفقہ دونوں میں دلچسپی رکھتے تھے اور مالوہ کے صدر (مذہبی امور کے نگراں) کی حیثیت سے حکومت کی انتظامیہ سے بھی منسلک تھے ایک بار کسی مجلس میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۲۴ (واذابتلیٰ ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن) سے متعلق امام بیضاوی کی تفسیر زیر بحث آئی۔ بعض علماء کو اس پر اعتراض تھا جبکہ شیخ منور اس سے متفق تھے۔ ان کے مشورہ پر بادشاہ نے اس آیت کی تفسیر پر باقاعدہ ایک مجلس مذاکرہ منعقد کی اور اس کی صدارت کے فرائض قاضی صدرالدین لاہوری نے انجام دیئے، مباحثہ کے دوران شیخ منور نے اس پرزور و مدلل انداز میں بیضاوی کے نقطۂ نظر کا دفاع کیا کہ صدر مجلس نے اختتامی کلمات میں یہ فرمایا کہ آج اگر ناصرالدین بیضاوی زندہ ہوتے تو وہ بھی شیخ منور کی تفسیری مہارت و دقیقہ سنجی کی داد دیتے[۴۵]۔ اس زمانے کے بعض وزراء (جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا) بڑی اچھی علمی صلاحیت کے مالک تھے اور علم کی اشاعت میں دلچسپی بھی لیتے تھے۔ عہد شاہجہانی کے ان وزراء میں سعد اللہ خاں اور دانشمند خاں میر بخشی شامل تھے۔ اسی عہد کا ایک مشہور مباحثہ "ایاک نعبدو وایاک نستعین" کی تفسیر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے خاص شرکاء ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور دانشمند خاں تھے۔ سعد اللہ خاں اس مباحثہ کے حکم مقرر ہوئے تھے[۴۶]۔ بحث ومباحثہ کی ان مجالس کی تفصیلات دستیاب نہیں تاہم ان بکھرے ہوئے مواد سے جو نتائج اخذ ہوتے ہیں وہ دلچسپی واہمیت سے خالی نہیں ہیں۔ یہاں اس پر اتنا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ حکومت کے زیر اہتمام یا سلاطین وامراء کی زیر نگرانی منعقد ہونے والی ان علمی مجالس ومذاکرات کے علاوہ علماء میں خود اپنے طور پر مختلف مسائل پر اجتماعی غور وفکر اور مباحثہ کا رواج عام تھا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ تفسیر وفقہ، شعر وادب، فلسفہ ومنطق یا کسی

اور موضوع سے متعلق ان مباحثوں اور مذاکروں سے لوگ وسیع پیمانہ پر مستفید ہوتے تھے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی وجہ سے گہرے مطالعہ و تحقیق کا ذوق فروغ پاتا تھا اور کسی مسئلہ پر شواہد و دلائل کے ساتھ اظہار خیال کی صلاحیت کو جلا ملتی تھی اور یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی بھی میدان میں مہارت کے حصول کے لیے زادِ راہ بنتی ہیں۔

صوفیاء کی مجالس و خانقاہیں:

عہد اسلامی کے ہندوستان میں تعلیم کے غیر رسمی ذرائع میں صوفیاء کی مجالس اور خانقاہوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ مشاہیر صوفیاء کی خانقاہوں کی سرگرمیوں اور ان کی مجالس کی روداد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تعلم و تعلیم کے نقطۂ نظر سے بھی افادیت رکھتی تھیں۔ ایک تو ان خانقاہوں میں کچھ مخصوص کتابوں کا درس دیا جاتا تھا اور تاریخ تصوف کے بعض ماہرین کے مطابق یہ کتابیں زیادہ تر تصوف و تفسیر سے تعلق رکھتی تھیں ۴۷۔ دوسرے بعض صوفیاء جو علماء کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور درس و تدریس کو پسند کرتے تھے وہ کچھ وقت نکال کر خانقاہ یا اس سے ملحق کسی حجرہ میں اپنی پسند کے مضمون کی کتابیں پڑھاتے رہتے تھے اور اہلِ خانقاہ اور عام شائقین علم ان سے مستفید ہوتے تھے۔ تیسرے کبار صوفیاء یا مشائخ کی تذکیری و تربیتی مجالس میں بعض اوقات زیر بحث مسئلہ پر قرآنی آیات واحادیث کی تشریح و ترجمانی ہوتی تھی، کبھی حاضرین کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے قرآن و حدیث کے حوالہ سے دریافت طلب امور واضح کیے جاتے تھے۔ بعض دفعہ کسی آیت و حدیث کے ظاہری تعارض جیسے مشکل مسائل بھی ان مجالس میں حل ہوتے تھے ۴۸۔ مزید براں کچھ صوفیاء اپنے مریدوں کے سامنے ضروری فقہی مسائل بیان کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے اور حاضرین مجلس کے استفسارات اور ان کے جوابات کا سلسلہ بھی رہتا تھا۔ اس طرح یہ مجالس حاضرین کو قرآن، حدیث و فقہ کے بارے میں بہت سی مفید معلومات بہم پہونچانے کا ذریعہ بنتی تھیں اور بالآخر علم کی اشاعت میں معاون ثابت ہوتی تھیں۔ اس ضمن میں شیخ

فرید الدین گنج شکر، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، شیخ نظام الدین اولیاء، شیخ نصیر الدین چراغ دہلی، سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں، خواجہ حسین ناگوری، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی مجالس زیادہ اہمیت رکھتی ہیں مشاہیر صوفیاء کے ملفوظات (ان کی روزمرہ مجالس کی روداد) اور ان کے تذکروں کے مطالعہ سے زیر بحث مسئلہ سے متعلق بڑے دلچسپ واہم حقائق سامنے آتے ہیں۔ یہاں مثال کے طور پر چند کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

شیخ نظام الدین اولیاء کے مریدین میں مولانا فخر الدین زرادی سلطان محمد بن تغلق کے معاصر تھے اور فقہ کے درس میں کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ شیخ کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کے بعد ان کا بیشتر وقت ان کی خانقاہ میں گذرنے لگا۔ وہاں بھی انھوں نے درس کا سلسلہ جاری رکھا۔ خانقاہ سے متصل ہی ایک عمارت میں وہ روزانہ نماز چاشت کے بعد فقہ حنفی کی مشہور کتاب ''ھدایہ'' کا درس دیتے تھے۔ صاحب سیر الاولیاء کے بیان کے مطابق ان کے درس میں بہت سے لوگ شریک ہوتے تھے ۴۹۔ کس طرح صوفیاء کی مجالس میں بعض اوقات ضمناً درسی کتب کے مسائل حل ہوتے تھے اس کا ایک نمونہ انہی شیخ کے بعض دوسرے مریدوں کے حالات میں ملتا ہے۔ ایک دفعہ شیخ نظام الدین اولیاء نے اپنے مرید مولانا شمس الدین یحیٰی اودھی سے ان کی زیر درس کتابوں کے بارے میں معلوم کیا تو انھوں نے ''اصول بزدوی'' کا ذکر کیا۔ شیخ نے اس پر ان سے بہت سے سوالات کیے۔ آخر میں مولانا شمس الدین نے شیخ کے سامنے اس کتاب کے مشکل مباحث رکھے جو ان کی سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ شیخ نے ان کی تشریح فرمائی جس سے مولانا بہت متاثر ہوئے اور شیخ سے ان کی عقیدت اور گہری ہوگئی ۵۰۔ یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ شیخ نظام الدین اولیاء کو اپنے مرشد خواجہ فرید الدین گنج شکر سے جو خلافت نامہ عطا ہوا تھا اس میں مبادیات دین کی ایک کتاب ''تمہید المبتدی'' (مصنفہ ابوشکور السالمی) کے پڑھانے کا اجازت نامہ بھی شامل تھا یعنی انھیں اس کی سند ملی تھی کہ شیخ فرید نے یہ کتاب انھیں پڑھائی تھی

Marfat.com

اور اب وہ دوسروں کو اسے پڑھانے کے مجاز ہو گئے ہیں۔ خلافت نامہ میں شامل اس اجازت نامہ کے الفاظ یہ ہیں۔

"فان الشروع فی الاصول یوسع دعاء الشہود و یبصر لمن یکرع منہا محارق الورد علی ان الطریق مخوف والعقبة کؤود۔ ونعم الکتاب فی ھذالفن تمہید المہتدی ابی شکور برداللہ مضجعه وقد قرأ عندی الولدالرشید الامام النقی العالم الرضی نظام الملة والدین محمدبن احمد زین الائمة والعلماء مفخر الاجلة والاتقیاء اعانه اللہ علی ابتغاء مرضاته وانالہ منتہی رحمته واعلیٰ درجاته سبقا بعدسبق من اوله الیٰ آخره قرأة تدبروایقان و تیقظ واتقان مستجمع رعایة سمع و درایة جنان وکماحصل الوقوف علیٰ حسن استعداده کذالك وفور تهیاء ه اجزته ان یدرس فیه للمتعلمین"۵۱

اس دور کے صوفیاء کی مجلسوں وخانقاہوں میں جس تفسیر کے پڑھنے پڑھانے کے متعدد حوالے ملتے ہیں وہ تفسیر مدارک (مدارك التنزیل مصنفہ حافظ الدین عبداللہ بن احمد نسفی (متوفی ۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء) ہے۔ خاص طور سے چشتی صوفیاء کے حلقوں میں یہ تفسیر بہت مقبول رہی ہے۔ بعض کتابوں میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ اس تفسیر کا درس چشتی مشائخ کے معمولات میں شامل تھا (ایں وظیفۂ تفسیر مدارک طریقہ سلوک مشائخ ایشاں است) ۵۲۔ چشتی صوفی شیخ حسام الدین مانکپوری (م ۱۴۴۹ء) کے بارے میں منقول ہے کہ وہ قرآن کریم میں غور وفکر کرتے اور اس کے معنی ومطالب کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور ہمیشہ تفسیر مدارک اپنے پاس رکھتے تھے اور جب کسی آیت کے سمجھنے میں دشواری ہوتی تو اس سے رجوع کرتے ۵۳۔ اسی طرح دوسرے مشہور صوفی خواجہ حسین ناگوری (م ۱۴۹۶ء) اپنے وطن میں ارشاد ووعظ کے ساتھ علوم دینیہ کے اشاعت میں بھی مصروف رہے۔ ان کے روزانہ کے معمولات میں تفسیر مدارک کا درس بھی شامل تھا جس کا وہ خاص اہتمام کرتے تھے ۵۴۔ ان کے

مریدوں میں شیخ احمد مجد شیبانی نارنولی (م ۱۵۲۱ء) نے اجمیر میں ایک طویل عرصہ تک ارشاد و تلقین کی مجلسیں جاری رکھیں۔ ان کے مشاغل میں دینی کتب کا پڑھانا بھی شامل تھا۔ وہ روزانہ عصر تا مغرب تفسیر مدارک کا درس دیتے تھے۔ جبکہ ظہر سے قبل دیگر درسی کتب کے پڑھانے میں مصروف رہتے تھے ۵۵۔ مزید براں عہد سلطنت کے مشہور صوفیاء کی مجلسوں میں کسی آیت کے معنی و مفہوم کی تعیین یا کسی نکتہ کی وضاحت میں جن تفاسیر کے حوالے ملتے ہیں ان میں تفسیر کشاف، تفسیر رازی، تفسیر زاہدی، تفسیر ناصری، تفسیر بصائر و عرائس البیان شامل ہیں ۵۶۔ ان سب کے علاوہ یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ خانقاہوں میں تصوف کی کتابوں کی درس و تدریس لازمی تصور کی جاتی تھی۔ شیخ کے معمولات میں مریدین یا سالکین کو تصوف کی کسی کتاب کا پڑھانا بھی شامل تھا۔ اس ضمن میں عوارف المعارف، فصوص الحکم، کشف المحجوب اور قوت القلوب جیسی کتب تصوف زیادہ متداول تھیں ۵۷۔

سائنسی علوم کی تجربہ گاہیں اور تکنیکی تربیت کے مراکز:

عہد اسلامی کے ہندوستان میں نہ صرف روایتی علوم کے باب میں تعلیم کی مختلف سہولتیں حاصل تھیں بلکہ بعض سائنسی علوم کے میدان میں تحقیق و تجربہ اور صنعت و حرفت سے متعلق تکنیکی تربیت کی آسانیاں بھی فراہم تھیں۔ اس دور کے حکمرانوں نے دینی تعلیم کے ساتھ اس زمانہ کے اعتبار سے عصری تعلیم کی اشاعت کی خدمت بھی انجام دی۔ عقلی و سائنسی علوم کے ماہرین کی سرپرستی فرمائی، تحقیق و تجربہ کرنے والوں کو انعام و عطیات سے نوازا اور بعض علوم بالخصوص ہیئت وطب کے میدان میں تجربہ و تربیت کے مراکز بھی قایم کیے۔ اس پہلو سے سلطان علاء الدین خلجی، سلطان فیروز شاہ تغلق، سکندر لودی، فیروز شاہ بہمنی، ہمایوں، اکبر اور شاہجہاں کا دور زیادہ مشہور ہے۔ بقول معاصر مؤرخ ضیاء الدین برنی سلطان علاء الدین خلجی کے دور میں دہلی میں حمید الدین مطرز جیسے ماہرین ہیئت وطب موجود تھے جو ان علوم میں یونان کے

Marfat.com

قدیم ماہرین کی ہمسری کے لایق تھے ۵۸۔ فیروز شاہ تغلق نے خاص اپنی نگرانی میں علم ہیئت کے میدان میں مطالعہ ومشاہدہ وتجربہ کا سب سے اہم آلہ اصطرلاب تیار کرایا اور دہلی کے قریب فیروز آباد میں ایک بلند وبالا منارہ پر نصب کرایا جو بظاہر رصدگاہ کا کام کرتا تھا۔ یہاں ہیئت دانوں کو مشاہدہ وتحقیق کی سہولتیں حاصل تھیں ۵۹۔ بعض مؤرخین کے بیان کے مطابق فیروز شاہ تغلق نے ایک ایسا نادر اصطرلاب بھی تیار کرایا تھا جو بآسانی ممکن الانتقال (Portable) تھا ۶۰۔ اس علم میں سلطان کی دلچسپی اس سے بھی عیاں ہے کہ اس نے اپنی نگرانی میں علم ہیئت پر سنسکرت کی ایک کتاب کا ترجمہ کرایا جو ''دلائل فیروز شاہی'' کے نام سے معروف ہوئی ۶۱۔ گویا وہ اپنے دور کے علماءِ ہیئت کو تحقیق وتجربہ میں آسانی کے لئے قدیم تحقیقات سے بھی روشناس کرانا چاہتا تھا۔ اسی دور میں گلبرگہ کی آزاد بہمنی ریاست مختلف علوم وفنون کی اشاعت کے لئے معروف تھی۔ اسی ریاست کے حکمرانوں میں تاج الدین فیروز شاہ بہمنی (۱۳۹۷۔۱۴۲۲ء) نے طبعی علوم کے فروغ میں خاصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور ملک کے مختلف حصوں کے سائنسی ماہرین کو اپنے دربار سے منسلک کیا جن میں علمائے ہیئت بھی شامل تھے۔ سلطان نے ان کی تحقیقی وتجرباتی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے کے لئے دولت آباد کے قریب بالا گھاٹ کی پہاڑی پر ایک رصدگاہ تعمیر کرانے کا منصوبہ بنایا اور اس کی نگرانی محمود گازرونی اور حکیم حسن گیلانی کے سپرد کی لیکن ابھی اس کی تعمیر جاری تھی کہ موخر الذکر وفات پاگئے اور یہ مکمل نہ ہو پائی ۶۲۔ مغل بادشاہ ہمایوں نے اصطرلاب کے ساتھ ساتھ ایک رصدگاہ کی تعمیر کا بھی منصوبہ بنایا تھا اور اس کے لئے تمام ضروری سامان مہیا کر لئے تھے لیکن کچھ ہی عرصہ بعد انتقال کر جانے کی وجہ سے یہ منصوبہ مکمل نہ ہو سکا ۶۳۔ عہدِ شاہجہانی کے ماہرِ علم ہیئت ملا فرید منجم تھے اور انھیں سلطان کی سرپرستی حاصل تھی۔ انھوں نے اس فن کے محققین کی دلچسپی کے لئے ایک زیچ (Astronomical Table) تیار کی تھی جو ''زیچ شاہجہانی'' کے نام سے معروف ہوئی ۶۴۔

Marfat.com

علم ہیئت کے علاوہ طب کے میدان میں بھی تعلیم و تجربہ کے کچھ مراکز قایم تھے۔ اس عہد میں جو شفا خانے یا اسپتال قایم کئے گئے تھے ان میں نہ صرف علاج و معالجہ کی سہولتیں مہیا تھیں بلکہ وہاں طلبہ کے لئے طب کے مختلف پہلوؤں پر لکچرس و عملی تجربہ کا اہتمام ہوتا تھا اور اس کے لئے ماہر اطباء کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ اس زمانہ کے متعدد ماہرین طب کے بارے میں یہ ذکر ملتا ہے کہ وہ طبابت کے ساتھ طب کی تدریس کا بھی مشغلہ رکھتے تھے ۶۵۔ عہدِ فیروز شاہی کے شفا خانوں (جنہیں اس وقت دارالشفا یا بیمارستان کہا جاتا تھا) کے بارے میں جو تفصیلات دستیاب ہیں ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ علاج معالجہ کے علاوہ طب کے میدان میں تعلیم و تربیت کے مرکز کا بھی کام دیتے تھے ۶۶۔ ان معلومات کی روشنی میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ عہد اسلامی کے ہندوستان میں ہیئت کے بڑے بڑے مشاہداتی مراکز اور طب کی عظیم الشان تجربہ گاہیں قایم تھیں لیکن ان سے بہرحال یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر کوئی ان علوم کو سیکھنا چاہتا اور ان میدانوں میں اعلیٰ سطح پر تحقیق و تجربہ حاصل کرنا چاہتا تو ان کے ماہرین موجود تھے، متعلقہ کتب دستیاب تھیں اور حکومت کی جانب سے مختصر ہی پیانہ پر سہی ان کے مراکز قایم تھے۔

جہاں تک عہدِ اسلامی کے ہندوستان میں تکنیکی و میکانکی تعلیم و تربیت اور ان کے مراکز کا تعلق ہے ان کی بابت معاصر وغیر معاصر مآخذ میں متفرق معلومات دستیاب ہیں ان سے دو تین باتیں اصولی طور پر معلوم ہوتی ہیں: اول یہ کہ اس زمانہ میں اس ملک میں کثیر تعداد میں فن کار، دستکار، کاریگر اور اہل حرفت و صنعت موجود تھے۔ دوسرے شاہی خاندان و اہل حکومت کے استعمال میں آنے والی چیزوں کے علاوہ مختلف قسم کے سامان، اوزار اور اسلحے اس ملک میں تیار ہوتے تھے۔ تیسرے مختلف چیزوں کو بنانے و تیار کرنے اور ان سے متعلق فن و ہنر کو سکھانے کے لئے ان کے انفرادی اور گھریلو مراکز کے علاوہ حکومت کی نگرانی میں کام کرنے والے ورکشاپ یا صنعتی مراکز بھی قایم تھے جنہیں اس دور میں ''کارخانہ'' کہا جاتا تھا۔ یہ

Marfat.com

کارخانے خاص طور سے حکومت واہل حکومت کے استعمال میں آنے والی چیزوں کے بنانے کے لئے قایم ہوتے تھے جن میں ماہر دستکاروں وکاریگروں کی رہنمائی میں دستکاری اور مختلف قسم کی حرفت کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ تکنیکی ومیکانکی تعلیم وتربیت کے دوسرے ذرائع خود فن کار، دستکار وکاریگر ہوتے تھے جو اپنے لڑکوں اور قریبی لوگوں کو اپنی دلچسپی کے فن وہنر سکھاتے تھے اور عام لوگ بھی ان سے فائدہ حاصل کرتے تھے۔ صنعت وحرفت کی تربیت کا یہ غیر رسمی طریقہ ہندوستان میں قدیم دور سے گاؤں وقصبات میں رائج تھا اور بہت سے تکلفات سے آزاد تھا ۶۷۔

عہدِ سلطنت میں کارخانہ یا صنعتی مرکز کے قیام ونظم کی تفصیلات سلطان فیروز شاہ تغلق کے دور سے متعلق ملتی ہیں۔ ان کے زمانے کے کارخانہ میں غلاموں کی تکنیکی وحرفتی تربیت کے لئے ایک خاص شعبہ تھا بلکہ مؤرخین کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انہی کی ٹریننگ کے لئے قایم کیا گیا تھا، یہاں یہ واضح رہے کہ سلطان نے غلاموں کی دینی تعلیم وتربیت کے ساتھ ان کی تکنیکی وفنی تعلیم وتربیت میں بھی خصوصی دلچسپی لی، اس کارخانہ میں ماہر دستکاروں وکاریگروں کی نگرانی میں مختلف قسم کے سامان تیار ہوتے تھے اور شاہی غلاموں کو دستکاری وکاریگری کی ٹریننگ بھی دی جاتی تھی۔ اس طرح معاصر مؤرخ عفیف کے بیان کے مطابق تقریباً تیرہ ہزار غلام دستکار وکاریگر بن گئے ۶۸۔ یہاں یہ واضح رہے کہ اس عہد میں حکومت کے کارخانوں میں جو چیزیں تیار کی جاتی تھیں ان میں خورد ونوش کے ظروف، لباس وزیورات، قالین، فرش، کمبل، سجاوٹ کے سامان، بادشاہ کی جانب سے تحفہ وانعام میں دی جانے والی اشیاء، شہ سواری کے اسباب، شکار وجنگ کے سامان اور تعمیرات کے اوزار واسباب شامل تھے۔

مغل دور میں بادشاہ وامراء کی شاہانہ زندگی میں ترقی اور حکومت کی ضروریات میں اضافہ کے ساتھ کارخانہ کے نظام میں اور بہتری ووسعت آئی۔ خاص طور سے اکبر نے اس کو کافی ترقی دیا اور اس کی نگرانی کے لئے ''شہرت عام'' (پبلک

Marfat.com

ورکس ڈیپارٹمنٹ) کے نام سے ایک مخصوص شعبہ قایم کیا جس کے اہم افسران میر سامان و دیوان بیوتات تھے ۶۹۔ اکبر خود شاہی کارخانوں کا معائنہ کرتا اور انکی کارکردگی کا جائزہ لیتا تھا اور بعض دفعہ خود اپنی نگرانی میں اپنی پسند کی عجیب وغریب چیزیں تیار کراتا تھا ۷۰۔ اس دور میں یہ کارخانے دہلی کے علاوہ بڑے بڑے شہروں میں قائم تھے۔ دوسرے معاصر مورخین اور سیاحوں کے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کارخانوں میں مختلف قسم کی چیزیں تیار کرانے کے لئے الگ الگ شعبے تھے جو ایک ماہر فن یا صنعت کی نگرانی میں کام کرتے تھے ۷۱۔ خاص طور سے آئین اکبری سے ان کارخانوں کے بارے میں بڑے اہم و دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں ۷۲۔ بہرحال قدیم وجدید مورخین کے بیانات سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستانی کارخانے نہ صرف صنعت کے مراکز تھے بلکہ صنعت وحرفت کی تربیت گاہ کی خدمت بھی انجام دیتے تھے اور یہ کہ اس وقت کے حکمراں ان کے نظم ونسق میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ دوسرے یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مورخین عام طور پر یہ اعتراف کرتے ہیں کہ مغل دور میں صنعت وحرفت کے میدان میں کافی ترقی ہوئی یہ امر بدیہی ہے کہ تکنیکی ومیکانکی تعلیم وتربیت کے اہتمام کے بغیر یہ ترقی ممکن نہ تھی ۷۳۔

ذاتی مطالعہ وتحقیق:

مدارس، انفرادی مراکز اور علمی مجالس کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں یا کسی مضمون میں اختصاص کی راہ میں ایک اور چیز جس کا اس وقت بہت سہارا لیا جاتا تھا وہ ذاتی مطالعہ یا کتابوں سے استفادہ تھا۔ اساتذہ وماہرین فنون سے رجوع کرنے کے ساتھ ذاتی مطالعہ وتحقیق سے کسی مضمون سے متعلق علم میں وسعت وگہرائی پیدا کرنے کی روایت اُس عہد میں نہ صرف قائم بلکہ بہت مستحکم تھی۔ اس بات کے واضح ثبوت ملتے ہیں کہ طباعت واشاعت کی موجودہ سہولیات کے فقدان کے باوجود مختلف موضوعات پر ضروری واہم کتابوں کی کمی نہ تھی۔ ایک دوسرے سے کتابیں

Marfat.com

مستعار لے کر پڑھنے کے علاوہ اہم کتابوں کی تلاش میں دور دراز کا سفر کرنا بھی کوئی بڑی بات نہ تھی۔ درسی کتب اور ان کی شروح کی نقلیں تیار کرنے میں عام دلچسپی پائی جاتی تھی۔ شائقین علم یہ نقلیں خود اپنے لیے تیار کرتے تھے اور دوسروں بالخصوص اصدقاء، اساتذہ، مشائخ کو ہدیہ کرنے کے لیے بھی۔ شیخ نظام الدین اولیاء کے ایک معتقد رکن الدین چغمرہ کتابت کا شغف رکھتے تھے انھوں نے بہت ساری کتابیں نقل کر کے اپنے مرشد کی خدمت میں پیش کیں۔ ان میں ''تفسیر کشاف'' اور ''مفصل'' کے نسخے بھی شامل تھے۴ے۔ آٹھویں صدی ہجری کے مولانا زین الدین دیوی کے بارے میں یہ ذکر ملتا ہے کہ انھوں نے شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کو صحیح مسلم کا ایک نسخہ نذر کیا تھا ۵ے۔ اس زمانہ کے بعض علماء ایسے بھی ملتے ہیں جو مختلف علوم وفنون کی کتابیں نقل کرتے وقت ان پر اپنی طرف سے شروح وحواشی بھی لکھ دیتے تھے تا کہ مطالعہ کے وقت الگ سے ان کی شروح کو دیکھنے کی ضرورت پیش نہ آئے ۶ے۔ بعض علماء کی رفتارِ کتابت کا یہ عالم تھا کہ وہ سیکڑوں صفحات کی کتابیں دو تین روز میں نقل کر دیتے تھے ۷ے۔ اور کچھ تو ایسے تھے جن کی نقل کی ہوئی کتابوں کی تعداد پانچ سو سے بھی زیادہ تھیں ۸ے۔ کتابوں کی نقلیں تیار کرنے کے سلسلہ میں یہ تو انفرادی کوششوں کا ذکر تھا۔ اس کے علاوہ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ اس زمانہ میں کتابیں نقل کرنے والوں یا ان کی کاپیاں تیار کرنے والوں کا باقاعدہ ایک طبقہ وجود میں آ گیا تھا جو اس کام کو پیشہ کے طور پر اختیار کرتا تھا یہ لوگ جو وراق یا نساخ کہلاتے تھے کتابوں کے بارے میں چھان بین کرتے اور معلومات رکھتے تھے کہ کون سی کتابیں کس شہر یا مقام پر کس کے پاس موجود ہیں تا کہ وہ ضرورت کے وقت ان کی نقلیں تیار کر کے شائقین کو فراہم کر سکیں اور یہ لوگ خود اپنے طور پر بھی اہم ومعروف کتابوں کی کاپیاں تیار کر کے فروخت کرتے رہتے تھے ۹ے۔ عام وراق ونساخ کے علاوہ اس زمانہ میں ماہرین کتابت یا خطاط معتد بہ تعداد میں پائے جاتے تھے۔ سلاطین وامراء دیگر فنون لطیفہ کے ماہرین کے ساتھ خطاطوں کی بھی کافی حوصلہ افزائی

Marfat.com

کرتے تھے اور اپنے دربار میں ان کی سرپرستی بھی کرتے۔ ظاہر ہے کہ ان کے فن کے مظاہر مختلف النوع تصانیف و تالیفات کی کتابت کی صورت میں سامنے آتے تھے جو خاص طور سے شاہی کتب خانہ کی زینت بنتی تھیں۔ یہ شاہی کتب خانے جو حکومت کی علمی سرگرمیوں کا ایک اہم حصہ ہوتا تھا دوسروں کے استفادہ کا ذریعہ بھی بنتا تھا ۸۰۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ طویل سفر کے دوران حشم وخدم کے ساتھ یہ کتب خانہ بھی بادشاہ کے ہم رکاب ہوتا تھا۔ جہانگیر نے گجرات کے ایک سفر میں وہاں کے بعض مشائخ کو شاہی کتب خانہ سے تفسیر حسینی و کشاف کے نسخے بطور ہدیہ پیش کیے تھے ۸۱۔ سلاطین و امراء کے علاوہ علماء کے اپنے ذاتی کتب خانے یا کتابوں کے ذخیرے بھی ہوتے تھے ۸۲۔ مختلف موضوعات کی بہترین وقیمتی کتابوں کا جمع کرنا ان کی علمی دلچسپیوں کا ایک خاص حصہ تھا۔ اس دلچسپی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ عہد عالمگیری کے ایک عالم میر سید عبدالجلیل بلگرامی بھکر (سندھ) میں وقائع نویس کے عہدہ پر مامور تھے لیکن اس سے سبکدوشی کے بعد وہ چھ ماہ تک بھکر میں اس لیے رکے رہے کہ انھیں وہاں صحیح بخاری کا ایک اچھا نسخہ دستیاب ہوگیا تھا اور وہ اسے نقل کرنے میں مصروف ہوگئے تھے ۸۳۔ اُس زمانہ میں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کی کثیر تعداد میں جو نقلیں تیار ہوئیں یا مختلف موضوعات کی جو کتابیں دستیاب تھیں ان کا ہلکا سا اندازہ آج برصغیر ہندوپاک اور برطانیہ کی لائبریریوں وکتب خانوں کے اس ذخیرۂ مخطوطات پر نظر ڈالنے سے لگایا جا سکتا ہے جو عہد وسطیٰ کے ہندوستان سے تعلق رکھتا ہے۔ ہلکا سا اندازہ اس لیے کہ ان مراکز میں صرف وہی مخطوطات پہنچ سکے جو ہندوستان میں مسلم حکومت کے خاتمہ کے بعد کسی طرح سرکاری تحویل میں آئے یا لائے گئے ورنہ جو نسخے انفرادی کتب خانوں اور اہل علم کے گھرانوں سے دستبرد زمانہ کے سبب یا بعد کی نسل کی اس علمی ورثہ کی ناقدری کی وجہ سے ضائع ہوگئے ان کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

ان سب کے علاوہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مختلف علوم وفنون بالخصوص

تفسیر، حدیث وفقہ کی امہاتِ کتب اور اہم مراجع کی دستیابی کا واضح ثبوت اُن کتابوں کے مآخذ وحوالہ جات سے فراہم ہوتا ہے جو اس عہد میں مرتب کی گئیں۔ ان تصانیف وتالیفات میں ایک دو نہیں سیکڑوں کتابوں کے نہ صرف نام بلکہ ان کے اقتباسات بھی ملتے ہیں اس ضمن میں خاص طور سے فتاوائے فیروز شاہی، فتاوائے تاتار خانی اور فتاوائے عالمگیری کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ موخر الذکر دونوں کتابیں متعدد جلدوں پر مشتمل ہیں اور ان کی تالیف وترتیب علماء کی ایک کمیٹی کی نگرانی میں انجام پائی۔ اس کمیٹی کو یہ خاص ہدایت تھی کہ مختلف مسائل پر فقہاء کے مابین جو اختلاف پائے جاتے ہیں ان کی نشاندہی کی جائے اور متقدمین فقہاء کی آراء کو جمع کیا جائے ۸۴۔ واقعۃً اسی طور پر یہ کتابیں مکمل ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ کثیر تعداد میں فقہ کی کتابوں کی دستیابی کے بغیر یہ اہم کام انجام نہیں پاسکتا تھا۔ یہی طریقہ ''تفسیر تاتارخانی'' کی ترتیب سے متعلق بھی اختیار کیا گیا۔ ہر آیت کی تفسیر سے متعلق قدیم مفسرین کی آراء کا استقصاء کیا گیا اور ہر اختلافی رائے کو صاحب تفسیر کے حوالے کے ساتھ مندرج کیا گیا ۸۵۔ تفسیر وفقہ کی کتابوں کو چھوڑ دیجئے حدیث جس سے متعلق عام طور پر تاثر پایا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اولین دور حکومت میں اس میدان میں مطالعہ ودرس میں کم دلچسپی لی گئی حتیٰ کہ اس فن کی امہات کتب بھی اس وقت دستیاب نہ تھیں۔ اس کی اہم کتابوں کی بھی اس زمانہ میں کمی نہ تھی۔ اس عہد کے علماء ومصنفین کی تحریروں میں نہ صرف صحاح ستہ بلکہ حدیث کی دوسری کتابوں کے حوالے بھی دستیاب ہیں ۸۶۔ علوم اسلامیہ کی کتابوں سے قطع نظر اس زمانہ کی تاریخ کی کتابوں میں تفسیر، حدیث وفقہ کے علاوہ دیگر موضوعات سے متعلق قدیم کتابوں کے اقتباسات یا حوالے بھی ملتے ہیں (مثلاً تاریخ، طب، منطق وفلسفہ وغیرہ) اس کا مطلب یہ ہے کہ ان موضوعات پر اہم کتابیں بآسانی دستیاب تھیں۔ ان تفصیلات سے یہ ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں علم کے کسی بھی میدان میں مہارت پیدا کرنے یا اپنی صلاحیت کو جلا بخشنے کے لیے ذاتی مطالعہ وتحقیق کی راہ بھی اپنائی جاتی تھی، اس کے لیے

Marfat.com

کتابوں کی دستیابی میں ممکن ہے کچھ دشواری پیش آتی رہی ہو لیکن یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جو ذاتی مطالعہ و تحقیق کی راہ میں حائل ہوتا۔

اوپر کے مباحث سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا صرف ایک ذریعہ (مدرسہ) نہ تھا۔ بلکہ اس کے مختلف ذرائع تھے جن میں سب سے زیادہ اہمیت علماء و فضلاء یا مختلف فنون کے اساتذہ کے انفرادی مراکز کو حاصل تھی۔ یہ مراکز عام طور پر کسی نہ کسی خاص مضمون میں درس کے لیے معروف ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شائقین علم مختلف مضامین میں اعلیٰ تعلیم یا اختصاص حاصل کرنا چاہتے تھے وہ مختلف انفرادی مراکز تدریس سے رجوع کرتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت بہت سے مدارس میں ایک عام انداز میں مختلف علوم و فنون کے میدان میں تعلیم کا اہتمام تھا لیکن جہاں تک کسی خاص مضمون یا فن میں حصولِ مہارت کا تعلق ہے اس کے لیے ان فنون کے اساتذہ و شیوخ سے استفادہ کرنے، ذاتی مطالعہ و تحقیق کے ذریعہ ان سے متعلق اپنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے اور بعض سائنسی مضامین اور صنعت و حرفت کے میدان میں ان کے تحقیقی و تجرباتی مراکز سے رجوع کرنے کا طریقہ معمول بہ تھا۔ شاذ و نادر ہی ایسی مثال ملے گی کہ کسی ایک مدرسہ یا انفرادی مرکز سے مستفید ہو کر کوئی شخص مختلف علوم و فنون یا علوم نقلیہ و عقلیہ کا ماہر بن گیا ہو۔ بلکہ تعلیم کے مختلف ذرائع اختیار کرنے کے بعد ہی یہ جامعیت نصیب ہوتی تھی، اس لیے موجودہ دور میں مدارس کے طلبہ سے یہ بیجا توقع نہیں کی جانی چاہئے کہ وہ مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہو کر اسلامی علوم کے ماہر و فاضل بن کر نکلیں گے اور ساتھ ہی سماجی و سائنسی علوم کے میدان میں بھی آفتاب و ماہتاب ثابت ہوں گے[٨٧]۔

☆☆☆

Marfat.com

حواشی و مراجع

١ اس باب میں تفصیلات کے لئے اس عہد کے علماء و صوفیاء کے مشہور تذکرے (اخبار الاخیار، سیر الاولیاء، منتخب التواریخ (جلد سوم) طبقات شاہجہانی، سبحۃ المرجان و مآثر الکرام) ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

٢ عبدالحمید لاہوری، بادشاہ نامہ، کلکتہ، ١٨٦٧ء، جلد اول حصہ دوم ص ٣٤٠، محمد صالح کنبو لاہوری، عمل صالح، کلکتہ، ١٩٣٩ء، ٣/٣٨٩، نزہۃ الخواطر، ٥/٣٨٤، ریاست علی ندوی، عہد اسلامی کا ہندوستان، پٹنہ، ١٩٥٠ء، ص ٢٨١

٣ غلام علی آزاد بلگرامی، مآثر الکرام، مفید عام پریس، آگرہ، ١٩١٠ء، ص ٢٢١-٢٢٢

٤ میر خورد کرمانی، سیر الاولیاء، موسسۂ انتشارات اسلامی، لاہور، ١٩٧٨ء، ص ٢١٥ نزہۃ الخواطر، ٢/١١٣

٥ سیر الاولیاء، ص ٢١٥، نزہۃ الخواطر ٢/٩٥-٩٦، محمد اسحاق بھٹی، فقہائے ہند، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ١٩٧٤ء، ١/٢٧٣-٢٧٦

٦ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، کلکتہ، ١٨٦٩ء، ٣/٢-٣، ٦٧، ٧٧، رحمان علی خاں تذکرہ علماء ہند، نولکشور، ١٩١٤ء، ص ٦٢، نزہۃ الخواطر، ٥/٣٨٤

٧ تذکرہ علماء، ہند، ص ٣٣٨، فقہائے ہند، ١/٢٩٤-٢٩٥

٨ نزہۃ الخواطر ٢/١٢٣، فقہائے ہند، ١/٢٧٣-٢٧٤

٩ تذکرہ علماء ہند، ص ٦٢

١٠ ولی اللہ، الغصان الاربعہ، ص ٥-٦، غلام علی آزاد بلگرامی، سبحۃ المرجان (تحقیق و تدوین: ڈاکٹر فضل الرحمن ندوی) علی گڑھ، ١٩٧٦ء، ص ٣٩، مآثر الکرام، ص ٢٢٠، تذکرہ علماء، ہند، ص ٢٤١، نزہۃ الخواطر ٦/٣٨٣

١١ سبحۃ المرجان، ص ٣٩

١٢ مقالات شبلی، ٣/١١٤

Marfat.com

۱۳۔ اغصان اربعہ، ص ۵، مقالات شبلی، ۲/ ۱۱۵

۱۴۔ سبحۃ المرجان، ص ۲۰۷، تذکرۂ علماء ہند، ص ۴۸، عبدالحی الحسنی، نزہۃ الخواطر، حیدرآباد، ۱۹۴۷ء، ۱/ ۱۳۷۔۱۴۱، سید حسن برنی، ۱/ ۱۴ صغانی، معارف، ۲۴/ ۱، جولائی، ۱۹۲۹ء، ص ۴۔۱۳

۱۵۔ نزہۃ الخواطر، ۲/ ۱۴۲۔۱۴۳، محمد اسحاق بھٹی، فقہائے ہند، ۱/ ۲۸۵۔۲۸۶

۱۶۔ تاریخ فرشتہ، ۲/ ۲۰۴، نزہۃ الخواطر، ۱/ ۱۵۷، فقہائے ہند، ۱/ ۱۴۰۔۱۴۱ علم حدیث میں برعظیم پاک وہند کا حصہ، ص ۷۶۔۷۷

۱۷۔ نزہۃ الخواطر ۲/ ۱۶۱، فقہائے ہند، ۱/ ۳۰۰

۱۸۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، انفاس العارفین (اردو ترجمہ: سید محمد فاروق القادری) مکتبہ الفلاح، دیوبند (بدون تاریخ) ص ۳۸۵۔۳۸۶، ۳۹۶۔۳۹۹، ۴۰۶، محمد رحیم بخش، حیات ولی، لاہور، ۱۹۵۵ء، ۴۲۳۔۴۳۰

۱۹۔ نزہۃ الخواطر ۲/ ۹۵۔۹۶

۲۰۔ اخبار الاخیار، ص ۱۴۱۔۱۴۳، نزہۃ الخواطر ۲/ ۲۸، سراج الہدایہ (مرتبہ قاضی سجاد حسین) نئی دہلی، ۱۹۸۳ء، ص ۴۔۵ (پیش لفظ)

۲۱۔ بدایونی، ۱/ ۳۳۲۔۳۳۴، مآثر الکرام، ص ۱۹۱۔۱۹۲ تذکرہ علماء ہند، ص ۱۰۱، ۱۳۹۔۱۴۰۔ مولانا ابوالعرفان ندوی نے اپنے ایک مضمون میں ملا عزیز اللہ تلنبی و ملا عبداللہ تلنبی کے ایران جا کر علوم عقلیہ کے حصول کا ذکر کیا ہے لیکن کسی معاصر ماخذ میں یہ حوالہ نہیں ملا۔ ملاحظہ فرمائیں دینی مدارس اور ان کے مسائل (مقالات سیمینار) ادارہ علمیہ، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص ۸۰

۲۲۔ سیر الاولیاء، ص ۲۱۵، نزہۃ الخواطر ۲/ ۱۱۳، فقہائے ہند، ۱/ ۲۷۰۔۲۷۱

۲۳۔ نزہۃ الخواطر، ۲/ ۸۰، فقہائے ہند، ۱/ ۲۴۲۔۲۴۳

۲۴۔ نزہۃ الخواطر، ۲/ ۱۸

۲۵۔ تذکرہ علماء ہند، ص ۱۵۴، مآثر الکرام، ص ۱۶۱

Marfat.com

۲۶ اُس وقت کی اصطلاح میں نقد عطیہ کو ''وظیفہ'' یا ''انعام'' اور آراضی کے عطیہ کو ''مدد معاش'' کہا جاتا تھا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں ابوالفضل، آئین اکبری، (تصحیح سرسید احمد خاں) سرسید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۰۵ء، ۱/ ۱۵۶، ۱۵۱ یوسف میرک، مظہر شاہجہانی، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد (سندھ) ۱۹۶۲ء، ص ۱۲۱، ۱۹۰۔۱۹۲،
Rafat M.Bilgrami, *Religious and* Quasi-*Religious* *Departments of the Mughal Period* ,New Delhi 1984 P.P. 59 -66

۲۷ سیرت فیروز شاہی، ص ۱۴۷، برنی، ص ۳۸۲، ۴۳۵، ۵۵۸۔۵۶۰، ۵۶۳، مرآت احمدی، ۱/ ۲۵۸، ۳۰۳، فرامین سلاطین (مرتبہ بشیر الدین احمد) دہلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، ۱۹۲۶ء، ص ۹۳، محمد کاظم، عالمگیر نامہ، کلکتہ، ۱۸۶۸ء، ۲/ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶، ساقی مستعد خاں، مآثر عالمگیری، کلکتہ ۱۸۷۱ء، ص ۵۲۹، بایزید بیات، تذکرہ ہمایوں و اکبر، کلکتہ، ۱۹۴۱ء ص، ۳۱۰۔۳۱۱، عہد اسلامی کا ہندوستان، ص ۲۸۴۔۲۸۵، اسلامی نظام تعلیم، ص ۲۴۔۲۵

۲۸ مآثر الکرام، ص ۱۵۲

۲۹ سیر الاولیا، ص ۲۸۵، اخبار الاخیار، ص ۹۳، تذکرہ علماء ہند، ص ۸۶، ۱۴۰، نزہۃ الخواطر، ۸۰/۱، ۱۰۸، ۱۴۷، سبحۃ المرجان، ص ۱۷۲

۳۰ نزہۃ الخواطر، ۲/ ۷۰، فقہائے ہند، ۱/ ۲۳۸۔۲۳۹

۳۱ فوائد الفواد، ص ۱۱۵۔۱۱۶، اخبار الاخیار، ص ۸۷، تذکرہ علماء ہند، ص ۲۴۰

۳۲ تاریخ فرشتہ ۱/ ۳۰۸، این این لا، ص ۸۴۔۸۵

۳۳ شاہنواز خاں، مآثر الامراء، کلکتہ، ۱۸۹۱ء، ۳/ ۶۹۔۷۴

۳۴ بدایونی ۳/ ۱۵۴۔۱۵۵، مآثر الکرام، ص ۲۳۷۔۲۳۸، تذکرہ علماء ہند، ص ۱۶۰

۳۵ برنی، ص ۵۶۵، نزہۃ الخواطر ۲/ ۱۷۳، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص ۲۳

۳۶ بدایونی ۱/ ۳۳۸، ۳/ ۵، ۷۵، ۱۲۹، اخبار الاخیار، ص ۲۵۱۔۲۵۲، علم حدیث میں برعظیم پاک و ہند کا حصہ، ص ۱۲۳۔۱۲۵

۳۷ مآثر الکرام، ص ۱۵۱

۳۸ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۵۴

۳۹ یحییٰ بن احمد سرہندی، تاریخ مبارک شاہی، کلکتہ، ۱۹۳۱ء، ص ۶۵ـ۶۶

۴۰ فتوح السلاطین، ص ۱۱۸

۴۱ عبداللہ داؤدی، تاریخ داؤدی، (تصحیح پروفیسر عبدالرشید)، علی گڑھ (بدون تاریخ) ص ۲۹ـ۳۰

۴۲ شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، محولہ بالا، ص ۳۸۲ـ۳۸۳

۴۳ حوالہ مذکور، ص ۱۲۹، ۱۳۰

۴۴ حوالہ مذکور، ص ۳۷۹ـ۳۸۲، فتوحات فیروز شاہی، محولہ بالا، ص ۸ـ۱۰، طبقات اکبری، محولہ بالا، ۱/۱۲۳ـ۱۲۴

۴۵ محمد غوثی شطاری، گلزار ابرار (اردو ترجمہ: فضل احمد) لاہور، ۱۳۹۵ھ، ص ۴۷۲ـ۴۷۵

۴۶ شاہنواز خاں، مآثر الامراء، کلکتہ، ۱۸۹۱ء، ۲/۳۰ـ۳۲

۴۷ Khaliq Ahmad Nizami, *Some Aspects of Religion & Politics in India during the Thirteenth Cenutry*, Delhi 1974,P.43

۴۸ فوائد الفواد (مرتبہ امیر حسن سجزی) لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۱۲۶ـ۱۲۷، ۲۹۴، ۳۶۰، ۴۲۲ـ۴۲۳، سراج الہدایہ، ص ۵۱، ۶۰، ۱۰۵، ۱۲۰، ۱۲۵

۴۹ سیر الاولیاء، ص ۲۷۸ـ۲۷۹، فقہائے ہند، ۱/۲۵۷

۵۰ اخبار الاخیار، ص ۹۷

۵۱ سیر الاولیاء، ص ۱۲۷ـ۱۲۸

۵۲ اخبار الاخیار، ص ۱۸۶

۵۳ اخبار الاخیار، ص ۱۰۷، نزہۃ الخواطر، ۳/۵۵

۵۴ اخبار الاخیار، ص ۱۸۵ـ۱۸۶

۵۵ اخبار الاخیار، ص ۱۸۶، تذکرہ علماء ہند، ص ۹ـ۱۰، گلزار ابرار، ص ۱۱۴ـ۱۱۵

۵۶ فوائد الفواد، ص ۱۰۱، ۱۸۷۔۱۸۸، خیر المجالس (مرتبہ حمید قلندر)، تصحیح پروفیسر خلیق احمد نظامی، علی گڑھ (بدون تاریخ) ص ۸۳، ۱۲۰، سراج الہدایہ، ص ۶۰، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۴۵، ۱۶۳، ۱۶۴ خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، جلد اول، ادارہ ادبیات دلی، دہلی، ۱۹۸۰ء ص ۴۰۷، ۴۱۰، ۴۱۲

۵۷ فوائد الفواد، ص ۴۳، ۱۲۷، ۱۴۱، خیر المجالس، ص ۲۳، ۵۸، ۱۵۵، ۱۷۸، ۲۴۹، اخبار الاخیار، ص ۱۶۳، ۱۹۵

۵۸ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۱۱۲

۵۹ سیرت فیروز شاہی، محولہ بالا، ص ۲۹۴۔۲۹۷

۶۰ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۷۰، نیز دیکھئے: Iqtidar Husain Siddiqui, "Science and Scientific Instruments in the Sultanate of Delhi", *Hamdard Islamicus* 17/3, Autumn 1994, PP. 11-12.

۶۱ سیرت فیروز شاہی، ص ۲۹۳، منتخب التواریخ، ۱/ ۲۴۹، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۳۹۹

۶۲ تاریخ فرشتہ، ۱/ ۳۰۷۔۳۰۸، ۳۶۱، مآثر الکرام، ص ۲۰۲ سید سلیمان ندوی، مقالات سلیمان (مرتبہ: شاہ معین الدین ندوی مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۶۸ء، (مقالہ: اسلامی رصد خانے) ۲/ ۲۶۲۔۲۶۴، مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص ۲۰۰ اقتدار حسین صدیقی محولہ بالا، ص ۱۳

۶۳ خواند میر، قانون ہمایونی، کلکتہ، ۱۹۴۰ء، ص ۶۸۔۶۹، ۱۱۰۔۱۱۲، ابوالفضل، اکبر نامہ، کلکتہ، ۱۸۷۷ء، ۱/ ۳۶۸، مقالات سلیمان، محولہ بالا، ۲/ ۲۶۳

۶۴ عمل صالح محولہ بالا، ۱/ ۳۶۱۔۳۶۲

۶۵ تذکرہ علماء ہند، ص ۲۳، ۵۱، نزهة الخواطر، ۴/ ۱۲، ۱۶۔۶۱، ۶۶، حکیم الطاف احمد اعظمی، تاریخ طب واطباء دور مغلیہ، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء

۶۶ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۵۵۔۳۵۹، سیرت فیروز شاہی، ص ۲۳۵۔۲۳۶،

Marfat.com

فتوحات فیروز شاہی ص ۱۵۔۱۶، طبقات اکبری محولہ بالا، ۱/ ۲۴۱، تاریخ فرشتہ ۱/ ۱۵۱،
مسلم ثقافت ہندوستان میں محولہ بالا ص ۲۹۴

۶۷؎ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں محولہ بالا ص ۱۴۲۔۱۴۴، نیز دیکھئے:

F.Bernier, *Travels in the Mogul Empire*,(1656-1668) (Eng.Tr.A Corntable),Oxford Unversity Press,London,1934 P. 259,Krishnalal Ray, *Education in Medieval India*. PP. 53,55

۶۸؎ عفیف، تاریخ فیروز شاہی ص ۳۳۹۔۳۴۰، مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں:

J.M. Banerjee,*History of Firuzshah Tughluq* ,Delhi.1967, PP. 183- 184

۶۹؎ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں ص ۱۴۶۔۱۴۸، کرشن لال محولہ بالا ص ۵۴۔۵۵

Ishtiaq Husain Qureshi, *The Administration of The Mughal Empire*, N.V. Publication , Delhi (n.d)V.A PP. 53,59,75-76,

V.A. Smith,*Akbar the Great Mughal*, Oxford, 1919,P. 410

۷۰؎ اکبر نامہ ۳/ ۴۹۱، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں ص ۱۴۷

۷۱؎ برنیر محولہ بالا ص ۲۵۴۔۲۵۵، ۴۰۲۔۴۰۴

۷۲؎ ابوالفضل، آئین اکبری، ۱/ ۶۴۔۹۱، نیز دیکھئے اشتیاق حسین قریشی محولہ بالا ص ۵۹۔۶۰

۷۳؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: W.H. Moreland, *From Akbar To Aurangzeb*,London.1923,PP. 52-58

۷۴؎ سیر الاولیاء ص ۳۲۷

۷۵؎ نزھۃ الخواطر، ۲/ ۴۶

۷۶؎ مآثر الکرام ص ۴۸، ۲۲۵، ۲۲۹

۷۷؎ مآثر الکرام ص ۵۳، اخبار الاخیار ص ۲۸۲۔۲۸۳

Marfat.com

۷۸ مآثر الکرام، ص ۱۹۷۔۱۹۸، نیز دیکھئے اخبار الاخیار، ص ۲۵۰
۷۹ فوائد الفواد، ص ۴۵۔ وراق ونساخ کے بارے میں تفصیل کے لئے دیکھئے: ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، محولہ بالا، ص ۵۱۔۵۴
۸۰ اسلامی نظام تعلیم ص ۳۴،۲۵، Abdul Aziz, *The Imperial Library of the Muqhals*, Delhi, 1974
۸۱ توزک جہانگیری، علی گڑھ، ۱۸۶۴ء، ص ۲۱۸
۸۲ اخبار الاخیار، ص ۸۷، ۲۵۰، مآثر الکرام، ص ۲۶۵
۸۳ مآثر الکرام، ص ۲۶۵
۸۴ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۹۲، عالمگیر نامہ، ۳/ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷، مآثر عالمگیری، ص ۲۳۹۔ ۲۴۰، نیز دیکھئے: ریاست علی ندوی، '' کچھ فتاوائے تاتارخانی کے بارے میں'' معارف، ۵۹/۳، مارچ ۱۹۴۷ء، ص ۱۶۵۔۱۸۰، مجیب اللہ ندوی، فتاوای عالمگیری اوراس کے مولفین، تاج کمپنی، دہلی (بدون تاریخ) ص ۱۳۔۲۰
۸۵ عفیف، ص ۳۹۲
۸۶ نزهة الخواطر ۲/ ۴۶، تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں: سید سلیمان ندوی، '' ہندوستان میں کتب حدیث کی نایابی کے بعض واقعات'' مقالات سلیمان، ۲/ ۷۶۔۷۸، محمد اسحاق، علم حدیث میں برعظیم پاک وہند کا حصہ، ص ۷۶۔ ۷۷، ۸۷۔۹۰، ۹۵۔ ۹۸، فقہائے ہند، ۱/ ۲۸۰، ۲۸۵، محمد اعجاز حسن خاں۔'' تیموری عہد سے پہلے ہندوستان میں علم حدیث کا رواج''، معارف، ۲۴/ ۴، اکتوبر، ۱۹۲۹ء، ص ۲۵۰۔۲۵۲
۸۷ اس موضوع پر تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیں: ظفر الاسلام اصلاحی '' قدیم وجدید تعلیم کا امتزاج۔ مسائل وتجاویز''، رفیق منزل (نئی دہلی) تعلیم نمبر، ۲/۶، جنوری ۱۹۹۳ء، ص ۳۷۔۴۲

Marfat.com

باب سوم

عہد اسلامی کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی درسیات

مدارس کے نظام تعلیم و تربیت میں نصاب کا مسئلہ بڑا اہم سمجھا جاتا ہے اور یہ آج ہی نہیں بلکہ ہمیشہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔ نصاب تعلیم دراصل تعلیم کے بنیادی مقاصد کے حصول کا سب سے اہم ذریعہ ہوتا ہے اور طلبہ کی تعلیمی زندگی کی نشوونما اور ان کی صلاحیتوں کی آبیاری میں ایک موثر کردار ادا کرتا ہے، دوسری جانب نصاب تعیم مدارس یا تعلیمی اداروں کی امتیازی خصوصیات کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس سے مختلف ادوار میں مسلمانوں کے تعلیمی رجحانات اور فکری میلانات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس لیے اگر مدارس کے نصاب کو مسلمانوں کی علمی دلچسپیوں اور تعلیمی ترجیحات کا Berometer کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ تعلیم ہر دور میں قوموں کی تمدنی و ثقافتی ترقی کے لیے بنیادی وسائل فراہم کرتی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل میں اس کے مفید و موثر ہونے کا بہت کچھ انحصار نصاب پر ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں نصاب اور اس کے جائزہ کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ گئی ہے کہ مذہبی و ثقافتی زندگی سے تعلیم کا رشتہ استوار ہونے کے ساتھ معاشی زندگی سے بھی اس کا بہت گہرا تعلق قائم ہو گیا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ یہ تعلق کسی نہ کسی حد تک پہلے بھی پایا جاتا تھا لیکن اس دور میں یہ تعلق جس قدر گہرا اور مستحکم ہو گیا ہے کہ ماضی میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس یا مسلمانوں کے دینی تعلیمی اداروں کے نصاب تعلیم پر غور و خوض میں دلچسپی کافی بڑھ گئی ہے اور اس میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت پر مباحثہ و مذاکرہ اور مختلف انداز میں اظہار خیال کا سلسلہ جاری ہے۔

جدید دور کے مدارس کی کڑی دراصل اس ملک میں مسلمانوں کے قدیم

نظامِ تعلیم سے جڑی ہوئی ہے جب یہاں ان کی اپنی حکومت تھی اور تعلیم کا نظام اپنے طور پر چلانے کی انھیں پوری آزادی حاصل تھی، اُس دور کے تعلیمی نظام بالخصوص نصاب کا مطالعہ اس لیے اور زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ موجودہ مدارس کے نصاب تعلیم میں ترمیم واصلاح پر بحث کے ضمن میں اکثر یہ خیال بڑے زور وشور سے پیش کیا جاتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مدارس کا نصاب تعلیم علوم نقلیہ وعقلیہ کا جامع تھا یا آج کل کی اصطلاح میں اس میں اسلامی وعصری دونوں قسم کے مضامین شامل تھے۔ اِس سیاق میں یہ مطالعہ بہت برمحل ہوگا کہ کیا اُس عہد میں واقعتاً باقاعدہ ایک نصاب تشکیل دیا گیا تھا اور درجات کی حد بندی ومدتِ تعلیم کی تعیین کے ساتھ طلبہ کو بہ یک وقت مختلف علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔

مراحل تعلیم:

زیر بحث موضوع پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ عہدِ اسلامی کے ہندوستان میں تعلیم کے کون کون سے مراحل تھے اور مراحل کی یہ تقسیم کس بنیاد پر قایم تھی ۔معاصر مآخذ میں دستیاب مواد کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آجکل کی طرح اُس وقت نہ تو جماعت کی تقسیم تھی اور نہ درجات کی حد بندی، اُس عہد میں درس وتدریس کے نظام پر پوری طرح کتابی انداز غالب تھا۔ اس لیے اگر تعلیم کے مختلف مراحل کی تعیین کی جاسکتی ہے تو وہ درسیات ہی کی بنیاد پر ممکن ہے۔ نوعیت یا معیار کے اعتبار سے درسیات کی الگ الگ قسمیں تھیں اور ایک قسم کی درسیات ختم کرنے کے بعد حسبِ خواہش دوسری کی تکمیل میں مصروف ہو جانا اس وقت کی عام روایت تھی۔ بعض لوگوں نے اُس زمانے کے تعلیمی مراحل کو موجودہ دور کی معروف اصطلاح کے مطابق ''ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ'' تین حصوں میں تقسیم کیا ہے[1]۔ لیکن معاصر مآخذ میں تعلیم کی مرحلہ جاتی تقسیم کی یہ اصطلاحیں نہیں ملتیں۔ اس زمانہ کی بعض کتابوں اور علماء وصوفیا کے تذکروں میں تعلیم کے ضمن میں ''علم فضل'' کی

Marfat.com

اصطلاح استعمال کی گئی ہے؎۲۔ اور اسی کو عام طور پر اعلیٰ تعلیم کے مرحلہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے قبل کے مرحلہ کے لیے کتابوں میں کوئی خاص اصطلاح نہیں ملتی لیکن لفظ "فضل" کے معنی و مفہوم کی روشنی میں بعض جدید دانشوروں نے اسے "علم ضروری" کا نام دیا ہے اور یہ خیال پیش کیا ہے کہ "علم فضل" سے پہلے جو کچھ حاصل کیا جاتا تھا وہ علم ضروری کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی تکمیل کرنے والے "دانشمند" کہلاتے تھے؎۳۔ یہاں یہ وضاحت بھی بے موقع نہ ہوگی کہ عہد وسطیٰ کے تعلیمی مراحل کے سلسلہ میں "علم ضروری" و "علم فضل" پر جدید دور میں سب سے پہلے مولانا سید مناظر احسن گیلانی ("ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" کے مصنف) نے تفصیل سے اظہار خیال کیا تھا۔ بعد میں اس سے متعلق جو کچھ لکھا گیا وہ زیادہ تر انہی کی نگارشات پر مبنی ہے؎۴۔

عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں مروجہ نصاب تعلیم کا جائزہ لیتے ہوئے یہ وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مضامین کی تعیین اور ان کے مباحث کی تحدید نصاب کا لازمی عنصر ہے اور اسے روبہ عمل لانے کے لیے تعلیم کے مختلف مراحل کی واضح تقسیم، درجات کی حد بندی اور مدتِ تعلیم کی تعیین درکار ہوتی ہے اور یہ چیزیں عہدوسطیٰ کے تعلیمی نظام میں مفقود نظر آتی ہیں۔ اس دور کے نظام تعلیم کے سیاق میں "نصابِ تعلیم" کی اصطلاح استعمال کرنا درست نہ ہوگا کیونکہ اس بات کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ حکومت کی مقرر کردہ کوئی کمیٹی یا معاصر علما کی کوئی مجلس تعلیم کے مختلف مراحل متعین کرکے ہر مرحلہ کے لیے کوئی نصاب تشکیل دیتی تھی اور پھر اسی نصاب کے تحت مدارس یا تدریس کے انفرادی مراکز میں تعلیم کا سلسلہ جاری ہوتا تھا۔

دوسرے یہ بھی واضح رہے کہ اس وقت مدارس کی کثرت کے باوجود اعلیٰ تعلیم کے تحت درس و تدریس کا معروف طریقہ یہ تھا کہ مختلف علوم و فنون کے لیے انفرادی تدریسی مراکز قائم تھے جہاں اساتذۂ فنون اپنی دلچسپی کے خاص مضمون میں درس دیتے تھے اور طلبہ و شائقین علم اپنی دلچسپی و رجحان کے مطابق ان کے درس میں

Marfat.com

یکے بعد دیگرے شریک ہوتے تھے۔ اس طریق تعلیم میں نہ تو درجات کی کوئی واضح تقسیم تھی اور نہ کسی خاص نظام الاوقات کے تحت مدتِ تعلیم کی تحدید یا مدرسہ اور اس کی عمارت کی قید و بند۔ اس صورت حال میں ظاہر ہے کہ درس و تدریس کے لیے کوئی باقاعدہ نصاب متعین نہیں کیا جا سکتا تھا، بلکہ درس و تدریس کے لیے ہر مضمون سے متعلق کچھ کتابیں منتخب کی جاتی تھیں۔ اس لیے اس عہد کے تعلیمی نظام پر بحث کے ضمن میں ''نصاب تعلیم'' کے بجائے درسیات کی اصطلاح استعمال کرنا زیادہ مناسب ہوگا جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے۔

مدارس و انفرادی مراکزِ تدریس میں پڑھائے جانے والے مضامین:

اُس زمانہ کی درسیات کا مطالعہ کرتے وقت ایک اہم سوال یہ سامنے آتا ہے کہ مدارس یا انفرادی مراکز میں کون کون سے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ معاصر مآخذ میں مدارس کی تعمیر و مرمت، ان کے تعمیراتی محاسن، انتظام و انصرام کے لیے حکومت کے عطیات اور طلبہ و اساتذہ کے لیے وظائف سے متعلق کافی معلومات دستیاب ہیں۔ لیکن درس و تدریس کے مختلف مراحل اور نصاب تعلیم یا درسیات کے بارے میں بہت کم مواد ملتا ہے اور یہ مواد بھی علماء و فضلاء اور صوفیاء و شعراء کے تذکروں میں منتشر یا غیر مرتب انداز میں پھیلا ہوا ہے۔ اس بکھرے ہوئے مواد کو یکجا کرنے سے جو تصویر ابھرتی ہے اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس عہد میں اعلیٰ تعلیم کے مرحلہ میں تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، ادب و علم معانی، منطق و فلسفہ، علم کلام و تصوف، ہیئت و ریاضی اور کیمیا و طب کے پڑھنے پڑھانے کا رواج تھا۔ تفصیلات کی کمی کی وجہ سے قطعی طور پر کہنا مشکل ہے کہ اس زمانہ کے تمام مدارس اور انفرادی مراکز میں ان مضامین کی تعلیم کا اہتمام تھا۔ البتہ عہد سلطنت میں سلطان التمش، علاؤ الدین خلجی، فیروز شاہ تغلق، سکندر لودی، مظفر شاہ گجراتی، ابراہیم شرقی (جونپور) اور محمود گاواں (بہمنی سلطنت، دکن) کے زمانہ کے بعض مدارس کے بارے

میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ بالخصوص ''مدرسہ فیروز شاہی'' کے بارے میں یہ واضح ثبوت ملتا ہے کہ اس میں فقہ، اصول فقہ، تفسیر، حدیث، نحو وصرف، معانی و بیان، علم نظر (مناظر) علم ریاضی، علم طبیعی، علم الٰہیات، علم طب، خطاطی کی تعلیم دی جاتی تھی ۵؎ جیسا کہ سابق باب میں تفصیل سے ذکر آچکا ہے۔ اس عہد کی کتابوں میں اہل علم وفن کی تعلیمی زندگی کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ ہر طالب علم بیک وقت ان تمام مضامین کو پڑھتا اور ان میں مہارت حاصل کرتا تھا۔ کچھ ہی ایسے مضامین (مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، نحو وصرف، زبان وادب وغیرہ) یا ان سے متعلق کتابیں ہیں جو اکثر علماء وفضلاء کی درسیات میں مشترک نظر آتی ہیں۔ باقی دیگر علوم کا سیکھنا اور ان میں مہارت کا حصول شائقینِ علم کی ذاتی دلچسپی اور انفرادی کوشش پر منحصر ہوتا تھا۔

علوم عقلیہ کی درسیات:

علوم عقلیہ کی نسبت سے یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے ان علوم کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ ان کی درس وتدریس کا باقاعدہ سلسلہ سلطان سکندر لودی کے زمانہ (۱۴۸۸۔۱۵۱۸ء) میں خاص طور پر اس وقت شروع ہوا جب ماہرینِ معقولات شیخ عبداللہ تلنبی وشیخ عزیز اللہ تلنبی ملتان سے شمالی ہند منتقل ہوئے اور ان علوم کی ترویج میں مصروف ہوئے ۶؎۔ اسی طرح یہ تاثر بھی دیا جاتا ہے کہ اس سے قبل ان کی درسیات بہت محدود تھیں، ہندوستان میں نہ تو اس کے ماہرین پائے جاتے تھے اور نہ ہی اس میدان میں اعلیٰ تعلیم کے مواقع دستیاب تھے۔ حقیقت یہ کہ اگر عہدِ سکندر لودی کے قبل کے علماء کی تعلیمی زندگی اور اُن کی علمی سرگرمیوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہوگا کہ اس عہد میں بھی اُن علوم وفنون کے ماہرین موجود تھے جو درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ دوسری جانب اس میدان میں دلچسپی لینے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ بہت سے ایسے شائقین تھے جو ان علوم میں حصولِ مہارت کے لیے

Marfat.com

اساتذہ سے استفادہ کے علاوہ ذاتی مطالعہ، تجربہ و مشق کی راہیں بھی اپناتے تھے۔
لاہور میں غزنوی سلطنت کے زمانہ میں (گیارھویں صدی عیسوی) ایک مشہور شاعر مسعود سعد سلمان گزرے ہیں جو عربی، فارسی و ہندوی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ انھوں نے عباسی دور کے ممتاز ہیئت داں البتانی کی مرتب کردہ زیچ اور کتاب التفہیم کے حوالہ سے اپنے اشعار میں جس باریک بینی و وضاحت سے علم ہیئت کے مسائل بیان کیے ہیں اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس علم پر اُن کی گہری نظر تھی ۷۔ لاہور ہی ان کا مولد تھا اور وہیں ان کی نشو ونما و تربیت ہوئی۔ اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ اس شہر میں مسلم حکومت کے ابتدائی دور ہی میں علم ہیئت کی تعلیم کے مواقع فراہم تھے۔ اس کے بعد کے دور (تیرہویں تا پندرھویں صدی عیسوی) سے متعلق معاصر مورخین کے بیانات سے یہ واضح ثبوت ملتا ہے کہ معقولات کی مختلف شاخوں میں مہارت رکھنے والے علماء معتد بہ تعداد میں پائے جاتے تھے۔ ضیاء الدین برنی کے بیان کے مطابق سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ میں منقولات کے ساتھ معقولات کے بھی ایسے ممتاز علماء موجود تھے جن کے ہمسر دوسرے مسلم ملکوں میں ملنے مشکل تھے ۸۔ اس عہد میں علم نجوم، ہیئت، منطق، فلسفہ و طب میں امتیاز پانے والوں میں شرف الدین، بدرالدین دمشقی، صدرالدین دہلوی، علم الدین، ضیاء الدین نخشبی اور اعزالدین بدایونی شامل تھے ۹۔ اس سے قبل سلطان جلال الدین خلجی کے دور میں سعد الدین دہلوی منطق و حکمت میں مہارت کی وجہ سے ''منطقی'' کے لقب سے معروف ہوئے ۱۰۔ سلاطینِ دہلی میں خاص طور سے محمد بن تغلق کو عقلی علوم میں دلچسپی اور اُن کی ترویج کے سلسلہ میں شہرت ملی ۱۱۔ اس سلطان کے معاصر علماء معقولات میں نجم انتشار، علیم الدین عضدالدین اور معین الدین عمرانی قابل ذکر ہیں۔ دونوں موخرالذکر اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ ان مضامین کی کتابوں کا درس دیتے تھے اور عضدالدین خود سلطان کے استادوں میں شامل تھے ۱۲۔ اسی دور میں علم طب کے میدان میں سرگرمی کا یہ عالم تھا کہ صاحبِ مسالک الابصار کے بیان کے مطابق سیکڑوں ماہرینِ

Marfat.com

طب سلطان کے دربار سے منسلک تھے[۱۳]۔ مزید براں سلطان فیروز شاہ تغلق کا زمانہ عام طور پر فقہی علوم کے غلبہ کے لیے مشہور ہے لیکن اس دور میں بھی عقلی علوم میں دلچسپی اور ان سے متعلق تدریسی و تصنیفی سرگرمیاں جاری رہیں۔ اس عہد کے بعض مدارس میں منطق، فلسفہ و علم کلام کے شامل ہونے کے واضح ثبوت بھی دستیاب ہیں۔ اس وقت جلال الدین رومی، جلال الدین کرمانی، عز الدین خالد خانی، عبد العزیز دہلوی وغیرہ متعدد ایسے علماء موجود تھے جو حکمت و فلسفہ اور علوم طبیعی میں خصوصی درک رکھتے تھے۔ اول الذکر شارح شمسیہ شیخ قطب الدین رازی کے شاگردوں میں سے تھے اور درس و تدریس ان کا خاص مشغلہ تھا، موخر الذکر دونوں علماء نے علم ہیئت کی بعض سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا اور یہ خود اس میدان میں ان کی دلچسپی کا غماز ہے[۱۴]۔ اس پر مزید اضافہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ عہد فیروز شاہی میں علم طب میں دلچسپی و مہارت رکھنے والوں کی کمی نہ تھی۔ اس عہد میں متعدد شفا خانوں کا قیام بھی اس فن کی ترویج میں سلطان کی دلچسپی کا مظہر ہے[۱۵]۔ یہ شفا خانے جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا نہ صرف علاج کی سہولتیں فراہم کرتے تھے بلکہ ان میں طب کی تعلیم و تربیت کے مواقع بھی مہیا تھے، ان تمام تفصیلات سے یہ ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ اس زمانہ میں جس کے بارے میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ معقولات کی تعلیم محض چند کتابوں (قطبی و شرح صحائف) تک محدود تھی، علمائے معقولات درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے اور جن لوگوں کو اس میدان میں اعلیٰ تعلیم کا حصول مطلوب ہوتا تھا وہ ان سے رجوع کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ذاتی مطالعہ و تحقیق بھی جاری رکھتے تھے۔ عہد وسطی کی اس روایت پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی رقمطراز ہیں: "دانشمندی یا ملائیت کے لیے جن علوم کا پڑھنا ضروری تھا ان کی تحصیل کے بعد اور کبھی اس کے ساتھ بھی بطور اختیاری مضامین کے اپنے اپنے رجحان و ذوق کے مطابق علوم (سائنس) فنون و صناعات (آرٹس) زبانوں (لنگویجز) میں سے جن چیزوں کے پڑھنے کی ضرورت تھی ان کے ماہرین سے عموماً لوگ پڑھتے تھے اور جن کے لیے

Marfat.com

صرف علمی مشق یا مطالعہ، مزاولت وممارست کی حاجت تھی، لوگ اس میں مشغول ہو جاتے تھے'' ۱۶۔ ان تمام باتوں سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ علوم نقلیہ ہو یا عقلیہ ہر میدان میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اس فن کے استادوں سے استفادہ کا رواج تھا جو الگ الگ حلقۂ درس قائم کیے ہوئے تھے درحقیقت مروجہ مضامین میں ایک عام سطح کی تعلیم کے بعد اُن میں سے کسی یا کچھ میں مہارت کے حصول کے لیے ذاتی محنت ومشقت زیادہ کام آتی تھی۔ قدیم وجدید طرز تعلیم کا موازنہ کرتے ہوئے علامہ شبلی نے قدیم نظام تعلیم کے اس مزاج وانداز کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

''قدیم اصطلاح میں کالج ایک شخص کے وجود کا نام تھا وہ جہاں بیٹھ جاتا تھا کالج بن جاتا تھا اس کے گرد مستفیدوں کی جماعتِ کثیر جمع ہو جاتی تھی۔ اس کے فیض کا بادل ہر وقت برستا رہتا تھا۔ دن رات جس وقت جو کچھ بولتا تھا علمی لکچر ہوتا تھا اس کے حرکات وسکنات، نشست برخاست، وضع قطع، طور طریقے سب خاموش علمی لکچر تھے، استادوں کا سلسلہ، شاگردوں کا سلسلہ درسلسلہ پھیلتا جاتا تھا یہاں تک کہ چند دن کے بعد یہ ذی روح کالج یونیورسٹی یا جامعہ اعظم بن جاتا تھا۔ آج کل لوگ کالج کی طرف منسوب ہوتے ہیں لیکن اس زمانہ میں شخص کی طرف منسوب ہوتے تھے...... آج کل کی یونیورسٹیاں یا کالج صرف بڑے بڑے شہروں میں قائم کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس وقت کے ذی روح کالج ہر قصبہ، ہر گاؤں اور ہر جھونپڑے میں قائم کیے جاسکتے تھے'' ۱۷۔

بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سلطان سکندر لودی کے عہد سے علوم عقلیہ کی درسیات میں اضافہ ہوا اور اکبر کے دور میں خود بادشاہ کی ذاتی دلچسپی اور ایران سے علمی وثقافتی تعلقات کی مضبوطی کی وجہ سے عقلی وسائنسی علوم کو کافی رواج ملا اور اس وقت کے مدارس میں ان کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی۔ آئین اکبری میں عہد اکبری کے مدارس میں پڑھائے جانے والے جن مضامین کا ذکر ملتا ہے ان میں حساب، فلاحت، مساحت، ہندسہ، نجوم، طب، منطق، علوم طبیعی وریاضی، تدبیر منزل وسیاست مدن بھی شامل ہیں ۱۸۔ بعد کے دور میں بھی درسیات کے باب میں یہ رجحان باقی رہا یہاں تک

Marfat.com

کہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں کچھ تبدیلی آئی اور دینی علوم کی درسیات پر خاص توجہ دی جانے لگی۔

درسیات کی نوعیت:

عہد زیر بحث کی درسیت کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ وہ زیادہ تر تمرینی و مماراتی نوعیت کی تھیں۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان سے مقصود طلبہ کو مختلف مضامین یا فنون سے متعلق معلومات کا خزانہ بہم پہونچانا نہیں بلکہ خزانہ تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا کرنا تھا۔ اسی کے پیش نظر درس و تدریس کے لیے ایسی کتابیں منتخب کی جاتی تھیں جن سے انھیں ذہنی مشق حاصل ہو اور اُن کی قوت مطالعہ تیز ہو۔ ان میں اصلاً ایسی صلاحیت واستعداد پروان چڑھانا مطلوب تھا کہ اگر وہ مروجہ درسیات کی تکمیل کے بعد کسی مضمون میں مہارت حاصل کرنا یا اختصاص پیدا کرنا چاہیں تو انھیں اپنے مطالعہ وتحقیق کو آگے بڑھانے اور مذکورہ مقصد کی تکمیل میں کوئی دشواری نہ پیش آئے اسی وجہ سے علوم آلیہ (نحو وصرف، زبان وادب، بلاغت ومعانی، بیان و بدیع) کی تحصیل پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی اور مختلف مضامین کی مجمل ومغلق اور لغوی وفنی اعتبار سے پیچیدہ کتابیں پسند کی جاتی تھیں۔ تفسیر، فقہ، اصول فقہ وادب کے لیے بالترتیب کشاف، ہدایہ، بزدوی، مقامات حریری جیسی کتابیں اسی نوعیت کی تھیں۔ ان سے طلبہ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور دوسروں کے مطالب گرفت کرنے کی لیاقت پروان چڑھتی تھیں ۱۹۔ مزید براں یہاں یہ بھی پیش نظر رہے کہ اس وقت کی درسیات میں منطق وفلسفہ کی کتابوں کی جو بھر مار تھی اس کی ایک وجہ غالباً یہ تھی کہ اس سے مذکورہ بالا مقصد (سوچنے وسمجھنے کی صلاحیت کی آبیاری) کے حصول میں کافی مدد ملتی تھی۔ منطق کا اس میں خاص معاون ہونا بالکل واضح ہے۔ اسی طرح اصول فقہ کے تحت جس انداز سے فقہی مسائل کے استنباط کا طریقہ سکھایا جاتا ہے اور دلائل و براہین کے استعمال پر زور دیا جاتا ہے اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس علم میں بھی قوت فہم کو

Marfat.com

تیز کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

درسیات کی تمرینی نوعیت پر ایک اور ثبوت اس سے فراہم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بعض درسی کتب (بالخصوص مشکل و پیچیدہ) کو بار بار ختم کرنے کی روایت بھی پائی جاتی تھی جیسا کہ متعدد معاصر علماء کی تعلیمی زندگی کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کچھ کے بارے میں یہاں تک صراحت ملتی ہے کہ انھوں نے بعض کتابوں کو چالیس مرتبہ ختم کیا۔ مثال کے طور پر عہد اکبری کے ایک عالم شیخ حاتم کے بارے میں مذکور ہے کہ انھوں نے بلاغت و معانی کی درسیات ''شرح مفتاح العلوم'' اور ''مطول'' کو اول تا آخر چالیس مرتبہ ختم کیا[۲۰]۔ اسی طرح مفتی جمال الدین دہلوی کی بابت یہ وضاحت ملتی ہے کہ انھوں نے ''عضدی'' (علم کلام کی ایک کتاب) کا چالیس مرتبہ درس لیا[۲۱]۔ یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اُس عہد میں درسی کتابوں کو زبانی یاد کرنے کی روایتیں بھی ملتی ہیں لیکن یہ وضاحت دستیاب نہیں کہ اس سے مقصود قوت حفظ مضبوط کرنا یا کچھ اور تھا۔ شیخ نظام الدین اولیاء کے بارے میں یہ ثبوت ملتا ہے کہ انھوں نے تعلیم کے دوران ''مقامات حریری'' کے چالیس اسباق زبانی یاد کر لیے تھے۔[۲۲] مسالک الابصار کے بیان کے مطابق محمد بن تغلق اور صاحب اخبار الاخیار و سیر الاولیاء کے بقول اس سلطان کے بعض ہم عصر علماء (مثلاً مولانا حسام الدین ملتانی) کو ''ھدایہ'' ازبر تھی[۲۳]۔ شیخ مبارک ناگوری سے علم قراءت کی مشہور کتاب ''شاطبیہ'' کا حفظ منسوب کیا جاتا ہے[۲۴]۔ بابا داؤد مشکوٰتی کشمیری ''مشکوۃ'' کے حافظ ہونے کی وجہ سے اس لقب سے معروف ہوئے[۲۵]۔ عبدالملک عباسی کو صحیح بخاری اور محمد معظم کو تفسیر بیضاوی زبانی یاد تھی[۲۶]۔ شیخ احمد فیاض امیٹھوی اور ملا جیون امیٹھوی کو اکثر کتب متداولہ حفظ کرنے کا امتیاز حاصل تھا[۲۷]۔

درسی کتب کا انتخاب:

عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی درسیات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ دلچسپ حقیقت

Marfat.com

بھی سامنے آتی ہے کہ اس وقت نہ صرف یہ کہ اعلیٰ تعلیم بہم پہونچانے میں علماء کے انفرادی تدریسی مراکز موثر کردار ادا کرتے تھے بلکہ درسی کتب کے انتخاب میں بھی یہی اساتذہ فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے۔ یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ اس زمانہ میں پڑھنے پڑھانے کے لیے مروجہ مضامین کے مباحث کی تعیین کے بجائے ان سے متعلق کتابیں منتخب کی جاتی تھیں۔ درسیات کا یہ انتخاب دراصل علماء وقت یا اساتذۂ فنون کے ذاتی رجحانات اور ان کی صوابدید پر مبنی ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ کتابوں کے انتخاب یا درسیات کی تعیین میں زمانہ ومقام کے اختلاف سے فرق پایا جاتا تھا۔ مزید براں بعض اوقات علماء کے مختلف حلقوں میں ان کی اپنی دلچسپی یا فکری رجحان کے اعتبار سے ایک ہی فن یا مضمون کی الگ الگ کتابیں رائج ہوتی تھیں اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ عہد سلطنت میں تفسیری درسیات میں زمخشری کی تفسیر ''کشاف'' کو (اپنے تمام تر قابل اعتراض پہلوؤں کے باوجود) سب سے زیادہ مقبولیت حاصل تھی لیکن صوفی صفت یا صوفیوں کے حلقہ سے تعلق رکھنے والے علماء میں تفسیر ''مدارک التنزیل'' (مصنفہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد النسفی) زیادہ مقبول تھی تاہم اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ ''کشاف'' بھی ان کے زیر مطالعہ رہتی تھی۔ پہلے یہ ذکر آ چکا ہے کہ تفسیر مدارک چشتی صوفی شیخ حسام الدین مانکپوری کی پسندیدہ تفسیر تھی جو ہر وقت ان کے پاس رہتی تھی جب بھی انھیں کسی آیت کے سمجھنے میں دشواری پیش آتی تو وہ اس سے رجوع کرتے۔ اسی طرح دوسرے چشتی بزرگ خواجہ حسین ناگوری (م ۱۴۹۶ء) کے روزمرہ کے معمولات میں تفسیر مدارک کا درس شامل تھا[۲۸]۔ انہی کے شاگردوں میں قاضی احمد مجد نارنولوی (م ۱۵۲۱ء) تاحیات درس وتدریس میں مصروف رہے۔ وہ روزانہ عصر سے مغرب تک تفسیر مدارک کا درس دیتے تھے[۲۹]۔ گرچہ معاصر تذکرہ نگار اور مورخین یہ وضاحت نہیں کرتے کہ صوفیوں کے حلقوں میں تفسیر مدارک کی مقبولیت کی کیا وجہ تھی لیکن بعض دیگر تفاسیر جو اس زمانہ میں صوفیوں کے حلقہ میں پڑھی پڑھائی جاتی تھیں ان کے بارے میں یہ واضح طور پر معلوم ہے کہ وہ صوفی نقطۂ نظر سے

Marfat.com

لکھی گئی تھیں۔ اس زمرہ میں تفسیر ''عرائس البیان فی حقائق القرآن'' (مصنفہ شیخ ابومحمد رزبہان بن ابی النصر) شامل تھی ۳۰۔

مذکورہ بالا مثالوں سے درسیات کے انتخاب میں انفرادی رجحانات وفکری میلانات کا عمل دخل اچھی طرح واضح ہوتا ہے۔ مزید براں اس وقت کی درسیات پر معاصر علماء یا اساتذہ کے اثرات کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ بعض جدید کتابوں میں عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں نصاب کی جس مرحلہ وار تبدیلی کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے وہ دراصل بعض علماء کے ذاتی رجحان یا کسی خاص فن میں کچھ استادوں کی خصوصی دلچسپی کا مظہر تھی۔ مسلم عہدِ حکومت کے اولین دور میں مرکزی ایشیا کے علماء وفقہاء کے زیر اثر اور حکومت کی انتظامی ضروریات کی وجہ سے فقہی علوم کو کافی رواج ملا۔ سکندر لودی کے زمانہ میں بعض علمائے معقولات نے علومِ عقلیہ کے میدان میں درس وتدریس پر خاص زور دیا اور اکبر کے دور میں کچھ ایرانی علماء وفضلاء کی وجہ سے عقلی علوم پر خصوصی توجہ دی گئی۔ بعد کے زمانہ میں علم حدیث میں دلچسپی رکھنے والے علماء کے زیر اثر اس علم کی اشاعت کا سلسلہ دراز ہوا اور اس فن کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے کا رواج بڑھا ۳۱۔

آخر میں عہد اسلامی کے ہندوستان کی درسیات سے متعلق ایک اور نکتہ کی جانب اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانہ کی درسیات پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض اوقات یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان میں بیرونی علماء ہی کی کتابیں شامل تھیں اور یہ کہ درس نظامی جاری ہونے کے بعد ہی ہندوستانی علماء کی کتابیں مروجہ درسیات کا حصہ بن سکیں ۳۲۔ یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ اس بات کے واضح ثبوت ملتے ہیں کہ درس نظامی کے وجود میں آنے سے بہت پہلے سے ہندوستانی مصنفین کی بعض کتابیں درسیات میں شامل ہوچکی تھیں۔ مثال کے طور پر حدیث کی درسیات میں مشارق الانوار ۳۳ (مولفہ حسن بن محمد صغانی لاہوری (م ۱۲۵۲ء) نحو میں الارشاد ۳۴ (قاضی شہاب الدین دولت آبادی م ۱۴۴۵ء) صرف میں رسالہ عثمانیہ ۳۵ (مولانا

Marfat.com

فخر الدین زرادی م ۱۳۴۷ء) اور حکمت میں شمس بازغہ[۳۶] (ملا محمود جونپوری م ۱۶۵۲ء) کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانہ میں ہندوستانی علماء نے مختلف علوم وفنون کی بنیادی کتب یا کلاسیکل متون پر متعدد شروح وحواشی تیار کیے تھے۔ عہد زیر بحث میں بیضاوی ومدارک، مشارق الانوار ومشکوٰۃ، ہدایہ ووقایہ، فصوص الحکم وعوارف المعارف، عقاید نسفی، عقاید عضدیہ، مواقف، شمسیہ، تہذیب المنطق، سلم العلوم، شمس بازغہ وحکمۃ العین پر بہت سے شروح وحواشی مرتب کیے گئے تھے۔[۳۷] اور یہ کتابیں اس زمانہ کی مقررہ درسیات کا حصہ بن گئی تھیں۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں جو کچھ نصابی خاکہ پایا جاتا تھا اس پر کتابی رنگ غالب تھا۔ درسیات کا انتخاب اس طور پر کیا جاتا تھا کہ ان کی تکمیل سے مضامین کو گرفت کرنے کی صلاحیت اور مختلف علوم وفنون کی کتابیں سمجھنے کی قوت پروان چڑھے۔ ان درسیات یا منتخب کتابوں کو اجتہادی یا تقلیدی نصاب کے پیمانہ میں ناپنا صحیح نہ ہوگا اس لیے کہ افہام وتفہیم کے لیے چاہے ہم ان کے لیے ''نصاب'' کا لفظ استعمال کریں لیکن صحیح معنوں میں اس طرح کی کوئی چیز واضح شکل میں اس وقت موجود نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے ''نصاب تعلیم'' میں مختلف مراحل میں جن تبدیلیوں کے رونما ہونے کا ذکر کیا جاتا ہے وہ کچھ کتابوں کے تغیر وتبدل یا بعض مضامین کی درسیات میں کمی بیشی کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ مزید براں معروضات بالا کی روشنی میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عہد وسطیٰ کے نظام تعلیم کا آج کل کے مدارس اور ان کے نصاب تعلیم وطرز تدریس سے موازنہ کرنا درست نہ ہوگا۔ خاص کر دونوں عہد کے مزاج ونظام تعلیم میں بیّن فرق کو ملحوظ رکھے بغیر یہ رائے دینا مناسب نہ ہوگا کہ جس طرح اس زمانہ کے نصاب میں مختلف النوع مضامین شامل تھے اسی طرح آج کے مدارس کے نصاب میں دینی علوم کے ساتھ سماجی وسائنسی علوم کو شامل کر کے ان اداروں کے فارغین کو مختلف علوم وفنون میں جامعیت سے متصف کیا جا سکتا ہے۔ درحقیقت دونوں عہد کے تعلیمی نظام کا موازنہ کرتے

Marfat.com

ہوئے عام طور پر یہ پہلو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں تعلیم حاصل کرنے کی کوئی خاص میعاد یا مدت مقرر نہیں تھی بلکہ علمی ذوق وشوق کا یہ عالم تھا کہ زندگی بھر اکتسابِ علم کا سلسلہ جاری رہتا تھا اس لیے مختلف علوم میں مہارت حاصل کرنا کچھ زیادہ دشوار نہ تھا۔ ایک میدان میں امتیاز پانے کے بعد دوسرے میدان میں تگ ودو شروع ہو جاتی تھی۔ آج کل کی طرح صورتِ حال یہ نہ تھی کہ طالب علم تعلیم کی ایک خاص منزل تک پہنچ کر یا کوئی مقررہ کورس پورا کرنے کے بعد معاشرتی ضروریات یا عملی زندگی کے تقاضوں سے مجبور ہو کر سلسلۂ تعلیم منقطع کر دیتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس زمانہ میں تعلیم سے کسب معاش کا تعلق اتنا گہرا نہیں تھا جتنا آج ہے۔ ان سب کے علاوہ یہ بات بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ عہد وسطیٰ میں مختلف علوم وفنون (یا بالفاظ دیگر قدیم علوم وعصری علوم) کے درس وتدریس کے نظام میں وہ واضح فرق نہیں تھا جو اس وقت پایا جاتا ہے۔ اس لیے ایک ہی نظام کے تحت مختلف علوم وفنون کی تعلیم کا اہتمام کرنا یا علوم نقلیہ وعقلیہ دونوں سلسلوں کو ایک ساتھ جاری رکھنا آسان تھا۔ موجودہ دور میں دینی علوم وعصری علوم کی تعلیم کے نظام اور درس وتدریس کے منہج میں اتنا بُعد پیدا ہو گیا ہے کہ دونوں میں امتزاج کی بات کرنا یا ایک ہی طالب علم سے دونوں میدانوں کو عبور کرنے کی توقع رکھنا نظری وفکری طور پر شاید صحیح سمجھا جائے لیکن عملی طور پر یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے اِلاّ آنکہ مدارس کا نظام تعلیم نیچے سے اوپر تک بالکل بدل دیا جائے اور جدید طرز پر اس کی پوری طرح اَور ہالنگ کر دی جائے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میجر آپریشن میں مدارس کی بنیادی خصوصیات باقی رہ پائیں گی کہ نہیں تجربہ ہی اس کا قطعی فیصلہ کر سکتا ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

حواشی و مراجع

۱۔ عہد اسلامی کے ہندوستان سے متعلق اس نوع کی مرحلہ وار تقسیم کے لیے ملاحظہ فرمائیں، سعید احمد رفیق، اسلامی نظام تعلیم بحوالہ بالا، ص ۵۵۔۵۶، ۲۶۴۔۲۷۴

۲۔ سیر الاولیا بحوالہ بالا، ص ۱۱۱۔ بعض کتابوں میں اسی (فضلا) معنی میں ایک دوسرا لفظ ''منتہیانہ'' بھی استعمال کیا گیا ہے (عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ، ۱/ ۳۲۴، ۳/ ۶۷

۳۔ سیر الاولیا، ص ۲۹۸، فوائد الفوائد ص ۱۵، ۳۷، ۱۱۱، ۱۱۴، ۱۵۳، اخبار الاخیار، ص ۶۷، ۸۰۔۸۱، ۹۸۔۹۹، ۱۴۴، ۱۵۰

۴۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۴۴ء، ۱/ ۱۳۶۔۱۴۰، ۲۹۹۔۳۰۰، ۳۰۷، ۳۰۹

۵۔ سیرت فیروز شاہی بحوالہ بالا، ص ۱۴۷، برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۵۶۴

۶۔ منتخب التواریخ، ۱/ ۳۲۳۔۳۲۴، تذکرہ علماء ہند، ص ۱۰۱

۷۔ دیوان مسعود سعد سلمان (مرتبہ ناصر ہیری) چاپخانہ فراین، ایران، خرداد ۱۳۶۲ھ، ص ۳۳۲۔۳۳۳، شبیر احمد خاں غوری، اسلامی ہند کے نصف اول میں علوم عقلیہ کا رواج، معارف ۹۱/ ۵، مئی ۱۹۶۳ء، ص ۳۳۹

۸۔ برنی تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۵۲۔۳۵۳

۹۔ برنی، ص ۳۶۲۔۳۶۴، نزہۃ الخواطر، ۲/ ۱۴۔۱۶، ۶۶، Promotion of Learning in India during Muhammadan Rule, op. cit., P 39

۱۰۔ برنی، ص ۱۹۸، نزہۃ الخواطر، ۲/ ۴۸۔۴۹

۱۱۔ برنی، ص ۳۶۴، نیز دیکھیے خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۳۲۷۔۳۲۹

۱۲۔ اخبار الاخیار، ص ۱۱۴، تذکرہ علماء ہند، ص ۲۲۸۔۲۲۹، فقہائے ہند، ۱/ ۳۰۴۔۳۰۵، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، بحوالہ بالا، ۱/ ۱۵۱۔۱۵۲

۱۳۔ شہاب الدین العمری، مسالک الابصار (تاریخ ہند پرنئی روشنی ۔ ۶ بی کی ایک قلمی کتاب سے/عربی متن مع اُردو ترجمہ) محولہ بالا ص ۳۰ (انگریزی ترجمہ: آٹو اسپیس) علی گڑھ ۱۹۴۳ء، ص ۳۲

۱۴۔ نزھۃ الخواطر ،۲/۲۲، سیرت فیروز شاہی، ص ۲۹۳، طبقات اکبری ۱/۲۳۴، نزھۃ الخواطر ،۲/۱۵، ۶۸

۱۵۔ فتوحات فیروز شاہی، ص ۱۵۔۱۶، طبقات اکبری، ۱/ ۲۴۱

۱۶۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ۱/۱۷۳

۱۷۔ مقالات شبلی ،۳/۱۰۲۔۱۰۳

۱۸۔ آئین اکبری، ۱/۱۶۰

۱۹۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ۱/ ۲۹۸۔۲۹۹، ۳۰۵

۲۰۔ بدایونی، ۳/ ۶۷، تذکرہ علماء ہند، ص ۴۵

۲۱۔ بدایونی ۳/ ۷۷، تذکرہ علماء ہند، ص ۴۳۔۴۴

۲۲۔ اخبارالاخیار، ص ۵۵، سیرالاولیاء، ص ۱۱۱

۲۳۔ مسالک الابصار، ص ۳۸، سیرالاولیاء، ص ۲۶۶، اخبارالاخیار، ص ۸۹

۲۴۔ تذکرہ علماء ہند، ص ۱۷۴

۲۵۔ تذکرہ علماء ہند، ص ۶۰، نزھۃ الخواطر ،۵/۱۴۵۔۱۴۶

۲۶۔ تذکرہ علماء ہند، ص ۲۱۳، نزھۃ الخواطر ،۴/ ۱۸

۲۷۔ تذکرہ علماء ہند، ص ۱۴، ۴۵

۲۸۔ اخبارالاخیار، ص ۱۷۷، ۱۸۵۔۱۸۶، نزھۃ الخواطر ،۳/ ۵۵

۲۹۔ اخبالاخیار، ص ۱۸۶، تذکرۃ علماء ہند، ص ۹

۳۰۔ محمد حسین الذہبی، التفسیر والمفسرون ، دارالکتب الحدیثہ ،القاہرہ، ۱۹۶۲ء، ۳/۵۶۔۵۸

۳۱۔ سید عبدالحئی الحسنی ،الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند، المجمع العلمی العربی، دمشق،

Marfat.com

۱۹۵۸ء، ص ۱۱-۱۷، دینی مدارس اور ان کے مسائل (مقالات سیمینار) جامعۃ الفلاح بلریا گنج ۱۹۹۰ء، (مقالہ: ''دینی مدارس اور جدید طریقۂ تدریس'' از مولانا ابوالعرفان ندوی) ص ۸۰-۸۱

۳۲۔ مقالات شبلی ۳/ ۹۹

۳۳۔ تذکرہ علماء ہند ص ۲۷۵، فقہائے ہند ۱/ ۹۶-۹۷، ۱۲۶، ۲۰۴-۲۰۵، ۲۴۰، ۲۷۰، ۲۸۸، ۳۰۵، الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۱۱ G.D.M Sufi, *Al-Minhaj* (The Evolution of Curriculum), Delhi, 1977, P.17

۳۴۔ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۱۱، ۲۰، فقہائے ہند ۱/ ۲۴۰، صوفی محولا بالا ص ۱۷

۳۵۔ اخبار الاخیار ص ۸۷، سیر الاولیاء ص ۱۱، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۲۰

۳۶۔ تذکرہ علماء ہند ص ۲۲۱، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۱۶، ۲۶۵

۳۷۔ سید عبدالحئی، اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں (اردو ترجمہ الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند از ابوالعرفان ندوی) دارالمصنفین، اعظم گڈھ ۱۹۶۹ء، ص ۱۵۵-۱۵۸، ۲۱۵-۲۱۷، ۲۱۹-۲۲۰، ۲۴۱-۲۴۲، ۲۶۰-۲۶۲، ۳۲۲، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۵۲-۳۵۴، ۳۵۸-۳۵۹، ۳۶۸-۳۶۹

Marfat.com

باب چہارم

تعلیمِ نسواں عہد اسلامی کے ہندوستان میں

اسلام اور تعلیم نسواں بڑا اہم ومختلف فیہ مسئلہ ہے جو اہل علم اور عام لوگوں میں بھی زیر بحث آتا رہتا ہے۔ اسلامی تعلیمات وقوانین کی روشنی میں اس پر اظہار خیال کیا جاتا ہے اور تاریخی تناظر میں بھی اس کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ جدید دور میں اس مسئلہ کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ گئی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے حوالہ سے اس کی بابت بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں خاص طور سے انھیں تعلیم نسواں کا مخالف کہا جاتا ہے۔ اس پس منظر میں زیر بحث موضوع پر مطالعہ وتحقیق کی اہمیت وافادیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے اور یہ ضروری ہوگیا ہے کہ اسلام اور تعلیم نسواں کی بابت صحیح صورت حال مختلف ذرائع سے واضح کی جاتی رہے۔

درحقیقت اسلام میں علم کا حصول مرد عورت دونوں کے لئے مطلوب ہے، قرآن وحدیث میں اس کی جو ترغیبات وتحریصات ملتی ہیں ان کے مخاطب دونوں ہیں اسی طرح جن آیات واحادیث میں اہل علم کے فضائل وامتیازات بیان کیے گئے ہیں وہ بھی بالکل عام ہیں۔ دوسرے اسلام میں فرد سے زیادہ اجتماعیت کو اہمیت دی گئی ہے اور اجتماعی زندگی کی تعمیر وترقی پر کافی زور دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب مسلم معاشرہ میں مرد عورت دونوں تعلیم سے بہرہ ور ہوں۔ مزید براں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہیں کہ عہد نبویؐ جو ہمارے لئے ہر اعتبار سے مثالی ہے اس میں عورتوں کے تعلیم حاصل کرنے اور مختلف علوم وفنون میں مہارت پانے کی بہت سی مثالیں دستیاب ہیں۔ علم کے باب میں صحابیاتؓ کا نبی کریم ﷺ سے مشتاقانہ استفادہ اور فقہی استفسارات کے لئے ان کی شدید طلب کے واقعات

Marfat.com

حدیث وسیرت نبوی کی کتابوں میں بکثرت منقول ہیں۔ یہ بات بخوبی معروف ہے کہ صحابیات کے ذوق وشوق کو دیکھ کر حضور اکرم ﷺ نے ان کی دینی تعلیم کے لئے ہفتہ میں ایک خاص دن مقرر فرمایا تھا ۱۔ علم کی راہ میں صحابیات کا ایک دوسرے سے استفادہ کسی ثبوت کا محتاج نہیں۔ اہم بات یہ کہ بعض صحابیات تعلیمی خدمات اور علم دین کی اشاعت کے لئے مشہور تھیں، ان میں حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت شفاء بنت عبداللہؓ، حضرت ام درداءؓ، حضرت سماء اسدیہؓ، حضرت زینب بنت ابوسلمہؓ و حضرت سعدہ بنت قمامہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ حضرت عائشہؓ اور بعض دیگر صحابیات سے حدیث وفقہ کے باب میں صحابہ وتابعین کے استفادہ کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ دوسری جانب حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے واقعہ کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی بہن حضرت فاطمہؓ اور ان کے شوہر حضرت سعید بن زید قبول اسلام کے بعد حضرت خباب بن ارتؓ سے قرآن پڑھا کرتے تھے ۲۔ ان تمام شواہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ متعلم ومعلم کی حیثیت سے سیکھنے وسکھانے کے عمل کو فروغ دینے میں صحابہ وصحابیات دونوں شریک رہے ہیں۔ دوسرے ان سے اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے کہ اسلام میں عورتوں کی تعلیم کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ عین مطلوب ہے۔ البتہ جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں سے متعلق اسلام کے کچھ قانونی حدود اور اخلاقی قیود ہیں، تعلیمی زندگی بھی ان حدود وقیود سے خالی نہیں ہے اور ان کا تعلق مرد وعورت دونوں سے ہے۔ گرچہ بعض قیود پردہ کے اہتمام یا عورتوں کی عزت وناموس کے تحفظ کے مقصد سے ان کے ساتھ مخصوص ہیں۔

عہد اسلامی کے ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ بہت پہلے سے زیر بحث آتا رہا ہے، اس عہد کی سماجی وتمدنی تاریخ پر مطالعات میں اس سے ضرور تعرض کیا جاتا ہے اور اب تو مختلف ادوار (بشمول عہد وسطی کا ہندوستان) میں عورتوں کی سماجی حیثیت مطالعہ وتحقیق کا دلچسپ موضوع بن گیا ہے اس سے متعلق کتب ومضامین میں عورتوں کے تعلیمی احوال وکوائف کا جائزہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔

Marfat.com

ان سب کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلم دور حکومت میں تعلیم نسواں پر کسی بھی زبان میں کوئی مبسوط مطالعہ سامنے نہیں آسکا ہے اور پیش نظر مطالعہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس کی اصل وجہ اس موضوع پر مواد کی قلت یا معاصر تاریخی مآخذ میں متعلقہ معلومات کی کم یابی ہے۔ دراصل عہد وسطیٰ کے مورخین کا عام رجحان یہ ہے کہ وہ بادشاہ، امراء، ان کے متعلقین اور حکومت کے عہدہ داروں کی زندگی وان کے کارناموں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ان کی سرگرمیوں کو نمایاں کرنے پر خاص توجہ صرف کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاصر تاریخی کتب میں عورتوں کی تعلیم کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں وہ خاص کر شہزادیوں یا حکمراں طبقہ کے خاندان کی خواتین سے تعلق رکھتی ہیں۔ مسلم معاشرہ کی عام خواتین کے بابت بہت کم مواد ملتا ہے اور جو ملتا ہے وہ بھی بکھرا ہوا ہے۔ علماء وصوفیاء، شعراء وادباء یا نامور شخصیات کے جو تذکرے مرتب کیے گئے ہیں وہ بھی صرف رجال سے متعلق ہیں۔ حیرت تو اس پر ہے کہ شاہ نواز خاں کی مرتبہ کتاب ''مآثر الامراء'' میں درباری امراء یا اہل حکومت کا تذکرہ حروف تہجی کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ باب میں مرتب کیا گیا ہے اس میں شہزادیوں وخواتین حرم کا تذکرہ ضمناً ملتا ہے لیکن ان میں سے کسی سے متعلق علیحدہ باب نہیں قائم کیا گیا۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جدید دور کے بعض اہل قلم نے عورتوں کی تعلیم پر مواد کی کمی کی ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ عہد وسطیٰ میں '' ایک مسلمان کے لئے عورت کا برملا ذکر آداب کے خلاف سمجھا جاتا تھا اور اگر کوئی مسلمان مورخ اس دستور کے خلاف کرتا تو وہ بھی ضمناً کرتا اور کسی اور موضوع کے سلسلہ میں کرتا''[۳]۔ یہ خیال بہت زیادہ قوی نہیں معلوم ہوتا خاص طور سے ان حالات میں جبکہ نہ صرف یہ کہ خاتون کی حکمرانی قبول کی گئی بلکہ بعض کتابوں میں ان کے اوصاف وکمالات بھی بیان کئے گئے۔ یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تصنیفی وتالیفی میدان میں جدید دور کی ترقیات کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ مختلف زبانوں میں عورتوں کے علیحدہ علیحدہ

Marfat.com

تذکرے مرتب کیے جانے لگے ہیں۔ ان میں خاص طور سے اعلام النساء/ ۵ جلدیں (مولفہ عمر رضا کحالہ)، شرف النساء (عنایت عارف)، Biographical Encyclopedia (کبیر کوثر) Dictionary of Prominent Muslim Ladies of Women (ارچنا چترویدی) قابل ذکر ہیں۔

میری معلومات کی حد تک جدید ہندوستان میں سب سے پہلے این۔ این۔ لا (N.N. Law) نے ۱۹۱۶ء میں شائع شدہ اپنی مشہور کتاب Promotion of Learning in India During Muhammadan Rule میں زیر بحث موضوع پر ایک مستقل باب کے تحت مواد جمع کیا تھا۔ بعد کے مورخین و مصنفین نے بنیادی طور پر اسی مواد سے فائدہ اٹھایا گرچہ تھوڑا بہت اس میں اضافہ بھی کیا ہے۔ جدید دور میں اس موضوع پر اپنے مطالعات پیش کرنے والوں میں یہ مصنفین شامل ہیں: سعید احمد رفیق (اسلامی نظام تعلیم)، ایس، ایم، جعفر (Education in Muslim India)، کرشن لال رائے (Education in Medieval India)، عبدالرشید (Society and Culture during Muslim Rule in India) یوسف حسین (Glimpses of Medieval Indian Culture) اور کے۔ ایم۔ اشرف (Life and Conditions of the People of Hindustan)

مسلم دور حکومت میں تعلیم نسواں سے بحث کرتے ہوئے جدید مورخین عام طور پر یہ تاثر پیش کرتے ہیں کہ:

۱۔ اسلام میں عورتوں کی سماجی حیثیت تعلیم نسواں کے لئے سازگار نہیں ہے۔
۲۔ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کی راہ میں پردہ حائل تھا۔
۳۔ مسلمان عورتوں کی تعلیم کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔
۴۔ مسلم حکمرانوں نے تعلیم نسواں کے اہتمام پر توجہ نہیں دی۔
۵۔ عہد وسطیٰ میں عورتوں کی تعلیم بادشاہ وامرا یا اعلیٰ طبقہ کے گھرانوں تک محدود تھی

ان خیالات کو پیش کرتے ہوئے غالباً ان حقائق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ:

Marfat.com

☆ عہد وسطیٰ کا مسلم معاشرہ روایتی معاشرہ تھا جس میں مذہبی روایات پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ ان میں عورتوں کے لئے پردہ کی پابندی بھی شامل تھی

☆ پردہ کی پابندی پر زور دینے یا عورتوں کی عزت وناموس کے تحفظ کے اہتمام کا یہ مطلب نہیں تھا کہ مسلمان تعلیم نسواں کے خلاف تھے یا اسے ناپسند کرتے تھے

☆ اس دور میں لڑکیوں کے لئے علیحدہ مدارس یا تعلیمی ادارے خال خال ہی تھے

☆ تدریس کے انفرادی مراکز میں عورتوں کے لئے نہ تو مخصوص انتظام تھا اور نہ معلمات کے زیر اہتمام خود عورتوں کے لئے اس طرح کے مراکز کے قیام کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔

☆ اس زمانہ میں عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے دو ہی ذرائع تھے۔ والد و قریبی اعزہ کے ذریعہ یا پرائیوٹ اساتذہ و ٹیوٹرس کے توسط سے۔

☆ معاصر مآخذ میں عام عورتوں کی تعلیم کے بارے میں بہت کم مواد ملتا ہے (جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا) اس لئے اس معاملہ میں کوئی عام حکم لگانا صحیح نہ ہوگا۔

جہاں تک لڑکیوں کی ابتدائی یا ضروری دینی تعلیم کا تعلق ہے مسلم معاشرہ میں اس کا نظم ہمیشہ رہا ہے اور عہد وسطیٰ کا ہندوستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا، اس تعلیم کے تین خاص ذرائع تھے (۱) باقاعدہ مکاتب کے ذریعہ (جو بالعموم مساجد سے ملحق ہوتے تھے) (۲) خود گھر کے لوگوں (والدین، سرپرست یا بوڑھی عورتوں) کے ذریعہ (۳) گھروں پر مقررہ استادوں یا استانیوں کے ذریعہ۔ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ ان تمام ذرائع سے لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو بھی تعلیم مہیا کی جاتی تھی اور خاص طور سے مکاتب میں مخلوط تعلیم کا نظم قایم تھا۔ معاصر مآخذ میں مکاتب کی تعلیم، درسیات و اساتذہ کی تقرری کے حوالے دستیاب ہیں[۴] لیکن یہ صراحت نہیں ملتی کہ اس میں لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں۔ غالباً اس وجہ سے کہ یہ قدیم زمانہ سے مسلم معاشرہ میں معمول بہ تھا۔ اس ابتدائی تعلیم کے مرحلہ میں لڑکیوں کو ناظرہ قرآن و ضروری دینی تعلیم کے علاوہ فارسی پڑھنے و لکھنے کی مشق کرائی جاتی تھی اور کچھ حساب وغیرہ بھی سکھایا جاتا

Marfat.com

تھا۔ فارسی کی درسیات (Reader) کے طور پر ایسی کتابیں (مثلاً سعدی کی گلستاں وکریما اور پند نامہ عطار) پڑھائی جاتی تھیں جو سبق آموز ہوں اور لڑکیوں کی اخلاقی تربیت میں معاون ہوں۔ یہاں یہ واضح رہے کہ اس دور میں بہت سی خواتین کے گھروں نے مکاتب کی حیثیت اختیار کر لی تھی جہاں محلّہ کی لڑکیاں بلالحاظ امیر وغریب ابتدائی تعلیم سے بہرہ ور ہوتی تھیں۔ اس طرح کے کسی مکتب میں لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ کی صورت میں خاتونِ خانہ (معلّمہ) بڑی لڑکیوں سے چھوٹی لڑکیوں کو پڑھانے کی خدمت لیتی تھیں اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ان گھریلو مکاتب کے بارے میں خاص بات یہ تھی کہ ان میں لڑکیوں کو کھانا پکانے، سلائی وکڑھائی کا طریقہ اور دوسرے امور خانہ داری سکھائے جاتے تھے اور استانیاں ان کی اخلاقی تربیت بھی کرتی تھیں۔ لڑکیوں کی اس تعلیم کے سلسلہ میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ بلا معاوضہ تھی۔ مسجد یا مسجد سے ملحق مکاتب میں کسی فیس وغیرہ کا سوال نہیں تھا۔ جو استانیاں اپنے گھروں پر پڑھاتی تھیں وہ بھی کوئی فیس وصول نہیں کرتی تھیں۔ حتی کی بعض بیوہ خواتین جو اپنے گھروں پر تعلیم کا اہتمام کرتی تھیں وہ محض اپنی دلچسپی سے یا نیک کام سمجھ کر یہ مشغلہ اختیار کرتی تھیں۔ ان کے سلسلہ میں بھی طالبات سے کوئی معاوضہ لینے کا ذکر نہیں ملتا۵ے۔ بہرحال ان گھریلو مکاتب میں استانیوں کی جانب سے ان سے کچھ ذاتی خدمت لینے کے امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

لڑکیوں کے لئے ابتدائی تعلیم کے ضمن میں بعض مصنفین نے یہ ذکر کیا ہے کہ عہد زیر بحث میں لڑکوں کی طرح لڑکیوں کی بھی رسم بسم اللہ یا مکتب کی رسم انجام پاتی تھی اور یہ اس طور کہ مکتب میں پڑھائی شروع کرتے وقت لڑکی کے والدین اور اعزہ واقرباء کو مدعو کیا جاتا اور استاذ ایک رنگین کاغذ پر کچھ دعائیہ کلمات وغیرہ لکھ کر لڑکی کو دیتا اور اس سے ان کے سامنے پڑھواتا تھا جس پر والدین استاد کو تحائف پیش کرتے۔ اسی طرح جب لڑکی کوئی نئی کتاب شروع کرتی تو اس موقع پر بھی والدین کی جانب سے استاد کو انعام واکرام سے نوازا جاتا۔ مزید براں کسی کے قرآن ختم کرنے

پر بھی اس کے والد یا سرپرست کی جانب سے استاد کو کچھ نہ کچھ ہدیہ کے طور پر دیا جاتا تھا[6]۔ واقعہ یہ کہ اس زمانہ کے معاشرتی حالات اور عام لوگوں کی سادہ زندگی کے پس منظر میں غالباً یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ لڑکیوں کے سلسلہ میں رسم بسم اللہ یا مکتب میں پڑھائی شروع کرنے کی رسم عام تھی، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاہی خاندان یا اعلیٰ طبقہ کے گھرانے کی لڑکیوں سے متعلق اس کی ادائیگی ہوتی تھی۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مغل دور کے شہزادوں و شہزادیوں کے سلسلہ میں ان رسوم کی انجام دہی کے بہت سے حوالے بھی ملتے ہیں[7]۔ ویسے والدین یا سرپرست کی جانب سے کسی خاص موقع پر اپنی وسعت کے مطابق اپنے لڑکے یا لڑکی کے استاد کو تحفہ بھیجنے کی روایت تھی جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور آج بھی دیہات کے مکاتب میں یہ روایت کسی حد تک برقرار ہے۔

جہاں تک لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کا تعلق ہے اس ضمن میں بھی (جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا) جو کچھ مواد دستیاب ہے وہ شہزادیوں یا امراء و اعلیٰ عہدہ داروں کی صاحبزادیوں سے متعلق ہے۔ اس لئے اسی کے مطالعہ و تجزیہ سے خواتین کی اعلیٰ مرحلہ کی تعلیم کے بارے میں کچھ باتیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن ان کی روشنی میں عام لڑکیوں کی تعلیم کی بابت کوئی قطعی نتیجہ اخذ کرنا غالباً صحیح نہ ہوگا۔ بہر حال اس زمانہ میں اعلیٰ مرحلہ میں لڑکیوں کی تعلیم میں جو دشواریاں تھیں ان سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ ان کی تعلیم کے لئے مخصوص انتظامات نہیں تھے یا ان کے لئے علیحدہ مدارس و تعلیمی ادارے قایم نہیں تھے (الا ماشاء اللہ) کہ وہ پردہ کی پابندی کے ساتھ ان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکیں اور اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس دور میں عام طور پر پردہ کا اہتمام پایا جاتا تھا اور نسبتاً متوسط طبقہ کے لوگوں میں اس کا زیادہ اہتمام تھا۔ اس صورت حال میں لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم دو ہی طریقہ سے ممکن تھی: والدین یا سرپرست کے توسط سے یا پرائیوٹ معلم و موودب کے ذریعہ۔ پہلی صورت اسی وقت قابل عمل ہوسکتی تھی جب والد یا سرپرست خود تعلیم یافتہ ہوں

Marfat.com

اور دوسرا طریقہ خوشحال گھرانوں میں محدود تھا، اس صورت حال میں اس زمانہ کی عام خواتین میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کی کم مثالیں ملتی ہیں تو کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔

شہزادیوں کی تعلیم کے نظام پر بحث سے قبل یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ عہد اسلامی کے ہندوستان میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے علیحدہ مدارس یا ان کی تعلیم کے مخصوص انتظام کے کچھ شواہد ملتے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے دو کا تعلق مرکزی حکومت (دہلی سلطنت) کے دائرہ کے باہر کے علاقوں سے ہے۔ مشہور افریقی سیاح ابن بطوطہ نے سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں ۱۳۴۱ء میں ہندوستان کا سفر کیا تھا اور یہاں کے حالات کا بخوبی مشاہدہ کیا تھا۔ ان کے بیان کے مطابق سلطان جلال الدین احسان شاہ نے جنوبی ہند میں اپنی حکومت (سلطنت مدورا کے نام سے) قایم کی تھی جو مالابار و کارومنڈل (Coromandel) کے درمیان راس کماری سے گلبرگہ تک پھیلی ہوئی تھی اس کا مرکز ہنور (Hinaur) (گوا کے جنوب میں ایک قدیم ساحلی شہر) تھا۔ سلطان جلال الدین نے تعلیم کی اشاعت میں کافی دلچسپی لی۔ اس کے زمانہ میں ہنور میں ۳۶ مدارس قایم تھے جن میں ۱۳ خاص لڑکیوں کے لئے تھے۔ ابن بطوطہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ لڑکیوں کے مدارس میں حفظ قرآن کا خاص اہتمام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس شہر میں کثیر تعداد میں حافظات پائی جاتی تھیں ۸۔ عہد سلطنت کے آخری حصہ میں مالوہ میں خلجی خاندان کی آزاد ریاست قایم تھی۔ اس خاندان کے سلاطین میں غیاث الدین محمود خلجی (۱۴۶۹ـ۱۵۰۰ء) انتظامی صلاحیت کے علاوہ رفاہی امور بالخصوص تعلیم کی اشاعت میں دلچسپی کے لئے معروف تھے۔ سلطان نے محل سرا کی خواتین کی تعلیم و تربیت پر بھی توجہ دی اور اس کے لئے باقاعدہ استانیاں مقرر کیا جو حرم کی خواتین بالخصوص کنیزوں کو پڑھاتی تھیں اور فرشتہ کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں کچھ حفظ بھی کراتی تھیں۔ اس لئے کہ انھوں نے ذکر کیا ہے کہ سلطان غیاث الدین کی کنیزوں میں ہزار کے قریب حافظات تھیں اور ان کا یہ معمول تھا کہ سلطان کے لباس تبدیل کرتے وقت وہ آیات کا ورد کرتی رہتی

تھیں۹۔ این۔ این۔ لانے ''واقعات مشتاقی'' کے حوالہ سے یہ واضح کیا ہے کہ سلطان کی کنیزوں میں ستر حافظات تھیں۱۰۔ مزید براں فرشتہ کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کنیزان حرم کو مختلف فن و ہنر بھی سکھائے جاتے تھے جن میں زرگری، آہن گری، خیاطی، مخمل بافی، جامہ بافی، تیرگری، کمان گری وکوزہ گری وغیرہ شامل تھے۱۱۔

شاہی محل میں خواتین حرم کی تعلیم کے لئے مخصوص انتظام کا ایک اور ثبوت مغل بادشاہ اکبر (۱۵۵۶۔۱۶۰۵ء) کے دور سے متعلق ملتا ہے۔ بادشاہ نے فتح پور سیکری میں شاہی محل کے چند کمرے خواتین حرم کی تعلیم گاہ کے طور پر مخصوص کرر کھے تھے۔ این این لانے اسمتھ کی کتاب (Architecture at Fathpur Sikri) کے حوالہ سے اپنی کتاب میں نقشہ کے ذریعہ شاہی محل میں ان کمروں کی پوزیشن واضح کی ہے اور یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ یہ حرم سرا کی خواتین کی تعلیم و تربیت کا باضابطہ مرکز تھا ۱۲۔ بعض اہل قلم نے اس سے آگے بڑھ کر یہ لکھ دیا ہے کہ ''اکبر نے فتح پور سیکری کے محل میں لڑکیوں کا ایک مدرسہ بھی قایم کرر کھا تھا'' ۱۳۔ یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا، دوسرے یہ تعجب خیز ہے کہ معاصر مآخذ میں سے کسی میں یہ ذکر نہیں مل سکا کہ اکبر نے شاہی محل کا ایک حصہ خواتین حرم کی تعلیم کے لئے مخصوص کرر کھا تھا۔

ان تفصیلات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں عورتوں کی علیحدہ تعلیم کے لئے کچھ مخصوص انتظامات پائے جاتے تھے دوسرے یہ ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ بعض مسلم بادشاہوں نے خواتین حرم کی تعلیم میں خصوصی دلچسپی لی تیسرے سب سے اہم نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ اس دور میں عام عورتوں میں بھی اعلیٰ تعلیم کا کچھ رواج تھا ورنہ لڑکیوں کے مخصوص مدارس اور شاہی محل کی خواتین (جن کی تعداد بشمول کنیز ان ہزار سے زیادہ ہوتی تھی) کو پڑھانے کے لئے کثیر تعداد میں معلمات یا استانیاں کہاں سے ملتیں۔

اوپر یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم سے متعلق جو کچھ مواد دستیاب ہے وہ شہزادیوں یا امراء کی صاحبزادیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ درحقیقت انہی کی تعلیمی

Marfat.com

زندگی اور علمی دلچسپیوں کے مطالعہ سے تعلیم نسواں کی بابت کچھ معلومات فراہم ہوتی ہیں اور انہی کی روشنی میں اس تعلیم کے نظام سے بحث کی جاتی ہے۔ یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ قدیم وجدید تمام مورخین کا اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ ہندوستان کے مسلم بادشاہان شہزادوں اور شہزادیوں کی تعلیم میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ عام طور پر چار سال چار ماہ و چار دن کی عمر کو پہنچنے پر ان کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوتا تھا۔ بادشاہ ان کے لئے معلمین/معلمات کے انتخاب میں کافی احتیاط سے کام لیتے تھے، مختلف علوم وفنون کے لئے مختلف اساتذہ مقرر کرتے اور ان کی کارکردگی پر نظر بھی رکھتے تھے، مزید براں بعض بادشاہ اپنی اولاد کو خود بھی تعلیم دیتے تھے اور ان کی تربیت کے لئے وقتاً فوقتاً نصیحت بھی کرتے رہتے تھے۔ اہم بات یہ کہ شہزادوں یا شہزادیوں کی تعلیم کے اہتمام میں مختلف رجحانات رکھنے والے بادشاہوں میں کوئی تفریق نہیں پائی جاتی تھی[۱۴]۔ کچھ شہزادیوں اور نامور خواتین کی تعلیم کے بارے میں جو مواد دستیاب ہے ذیل میں اسی کا مطالعہ وتجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

سلطانہ رضیہ (۱۲۳۶-۱۲۹۳۹ء)

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ رضیہ عہد اسلامی کی اولین مسلم خاتون حکمراں تھیں اور تعلیم یافتہ وبڑی خوبیوں کی مالک تھیں، مورخین نے ان کے بارے میں بڑے اچھے تاثرات ظاہر کیے ہیں اور سیاسی سوجھ بوجھ کے علاوہ ان کی دانش مندی، علم دوستی، جرأت مندی وانصاف پسندی کی تعریف کی ہے[۱۵]۔ اور بعض جدید مورخین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جس خوش اسلوبی سے انھوں نے حکومت کا کام وکاج انجام دیا اور اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اس میں ان کی تعلیم وتربیت کا بھی کافی دخل تھا[۱۶]۔ رضیہ کے بارے میں تاریخ فرشتہ میں یہ صراحت ملتی ہے کہ وہ فن قراءت سے بخوبی واقف تھیں[۱۷]۔ اس کا مطلب ہے کہ انھوں نے یہ فن کسی سے باقاعدہ سیکھا تھا۔ شہزادی نے کن استادوں سے تعلیم حاصل کی تھی اس باب میں کوئی وضاحت دستیاب

Marfat.com

نہیں البتہ صاحب ''طبقات ناصری'' کے بیان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کے والد سلطان التمش نے ان کی تعلیم وتربیت میں خصوصی دلچسپی لی تھی اور اُن کی علمی صلاحیتوں و دیگر خوبیوں کے پیش نظر شہزادوں کے ہوتے ہوئے انھیں اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا[۱۸]۔

بی بی صورت بنت ملک بسطام

بی بی صورت عہد سلطنت کے آخری حصہ میں افغان سلاطین کے دور میں حکومت کے ایک اہم عہدہ دار ملک بسطام کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے بارے میں یہ ذکر ملتا ہے کہ وہ فقہ کی ماہر تھیں اور فقہی مسائل میں دوسروں کی رہنمائی کرتی تھیں۔ خاص طور سے شاہی خاندان کی عورتیں ان سے شریعت کے مسائل دریافت کرتی رہتی تھیں[۱۹]۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف عام تعلیم بلکہ اعلیٰ سطح کی تعلیم حاصل کی تھی اور ان کی دلچسپی کا خاص میدان فقہ تھا۔

عہد سلطنت کی تاریخ کے ممتاز محقق ومصنف پروفیسر اقتدار حسین صدیقی کے بیان کے مطابق دستیاب شواہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لودی سلاطین کے زمانہ (۱۴۹۱-۱۵۲۶ء) میں شرفاء کے خاندان میں لڑکوں کی طرح لڑکیوں کی تعلیم کا بھی رواج تھا، افغان خواتین پردہ کی پابند تھیں اور ان میں تعلیم کا بھی کافی رجحان پایا جاتا تھا۔ مزید براں اوسط طبقہ کے گھرانوں میں لڑکیوں کو عام طور پر ناظرہ قرآن اور فارسی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی[۲۰]۔

گلبدن بیگم (۱۵۲۳-۱۶۰۳ء)

بابر کی صاحبزادی وہمایوں کی بہن گلبدن بیگم عالمہ، شاعرہ ومصنفہ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کی تعلیمی زندگی کی تفصیلات نہیں ملتیں سوائے اس کے کہ ان کی پرورش ایک ایسے گھرانہ میں ہوئی جس میں علم وادب اور شاعری کا عمدہ ذوق پایا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ ان کی تعلیم وتربیت ان کی سوتیلی ماں ماہم بیگم کی نگرانی میں ہوئی جنھوں نے انھیں اور ان کے بھائی ہندال کو متبنیٰ بنالیا تھا[۲۱]۔ وہ فارسی وترکی زبان

Marfat.com

کی ماہر، زبردست علمی صلاحیتوں کی مالک اور شعروادب کے ذوق سے مزین تھیں شہزادی کے علمی کارناموں میں "ہمایوں نامہ" معروف ہے جسے بادشاہ اکبر کی فرمائش پر انھوں نے تالیف کیا تھا ۲۲۔ یہ کتاب ان کی تصنیفی صلاحیت اور تاریخی ذوق کی آئینہ دار ہے۔ اسی سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت بہت اچھے ڈھنگ سے ہوئی تھی اور وہ علمی کاموں سے کافی شغف رکھتی تھیں۔ وہ بڑی سنجیدہ اور سلیقہ مند خاتون تھیں، امور خانہ داری سے جو کچھ وقت بچتا مطالعہ اور تصنیف وتالیف میں صرف کرتی تھیں۔ مصنفہ فاضلہ نے "ہمایوں نامہ" میں خود اپنی تعلیمی زندگی کے بارے میں تو کچھ نہیں لکھا لیکن اہم بات یہ کہ ان کے بیان کردہ واقعات سے اس عہد کے معاشرتی وتمدنی حالات اور اعلی طبقہ کے گھرانہ کی خواتین کی علمی وسماجی مصروفیات کے بارے میں مفید معلومات فراہم ہوتی ہیں خاص طور سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خواتین کو زبان وادب اور مذہب کی تعلیم دینے کے علاوہ فن سپہ گری وشہ سواری بھی سکھائی جاتی تھی اور وہ شعروشاعری وموسیقی کی محفلوں میں شریک ہوتی تھیں ۲۳۔

سلیمہ سلطان بیگم (م ۱۶۱۲ء)

بابر کی نواسی وہمایوں کی بہن گلرخ کی صاحبزادی تھیں۔ گرچہ ان کی تعلیمی زندگی کے کوائف سے بھی مآخذ خاموش ہیں لیکن ان کے سلسلہ میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ وہ پڑھی لکھی خاتون تھیں اور مطالعہ کی بہت شائق تھیں جہانگیر نے ان کی قابلیت وعلمی صلاحیت کا اعتراف کیا ہے فارسی زبان وادب سے انھیں خاص شغف تھا۔ وہ شاعری کا بھی شوق رکھتی تھیں اور "مخفی" تخلص اختیار کرتی تھیں ۲۴۔ وہ اکبر کی بیگمات میں سے تھیں اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھتی تھیں۔ بادشاہ کی ایماء پر شاہی خاندان کے بعض مشکل مسائل کو انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے حل کرادیا تھا ۲۵۔ ان کی ان صلاحیتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ تھیں اور ان کی تربیت پر خاص توجہ دی گئی تھی۔

Marfat.com

نور جہاں (مہر النساء) (۱۵۷۷ـ۱۶۴۵ء)

نور جہاں عہد جہانگیری کے بہت ہی بارسوخ امیر و وزیر مالیات اعتماد الدولہ (غیاث بیگ) کی صاحبزادی و جہانگیر کی اہلیہ تھیں۔ وہ تعلیم یافتہ اور عربی و فارسی کی عالمہ و شاعرہ تھیں۔ اعتماد الدولہ نے ان کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا تھا وہ خود علم و حسن اخلاق سے مزین اور زبان و قلم کی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کے اثرات صاحبزادی پر بھی پڑے ۲۶۔ ان کی اعلیٰ تعلیم کس طور پر ہوئی اس کی تفصیل دستیاب نہیں۔ البتہ یہ وضاحت ملتی ہے کہ وہ شعر و شاعری بھی کرتی تھیں اور موسیقی و نقاشی میں کمال رکھتی تھیں لطیفہ سنجی و حاضر جوابی میں ان کا جواب نہیں تھا مزید براں شہ سواری و فن سپہ گری کی تربیت بھی انہیں دی گئی تھی جیسا کہ مہابت خاں سے مقابلہ میں انھوں نے اس کا مظاہرہ کیا ۲۷۔ مختلف علوم و فنون میں ان کی مہارت سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ انھیں باقاعدہ ان کی تربیت دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے امور حکومت میں دلچسپی لی اور حکومت کا نظم و نسق چلانے میں بادشاہ کی معاونت کی۔ اس میدان میں بھی ان کی انتظامی صلاحیتیں ظاہر ہوئیں بعض جدید مورخین کی رائے میں ان اوصاف میں ان کی تعلیم و تربیت میں خاص اہتمام کا اثر دکھائی دیتا ہے ۲۸۔

ممتاز محل (ارجمند بانو) (۱۵۹۴ـ۱۶۳۱ء)

ممتاز محل آصف خاں کی صاحبزادی تھیں اور پہلے قدسیہ بیگم کے لقب سے معروف تھیں تاج محل کی نسبت سے ان کا نام زباں زد عام و خاص ہے، یہ بھی عہد مغلیہ کی مشہور پڑھی لکھی خواتین میں شامل تھیں۔ فارسی زبان سے بخوبی واقف تھیں اور شعر و ادب کا عمدہ ذوق رکھتی تھیں اور کبھی کبھی شعر کہنے کا شغل اختیار کرتی تھیں۔ موسیقی، نقاشی اور بعض دوسرے فنون سے بھی بہرہ ور تھیں ان کی تعلیمی زندگی کے بارے میں کوئی تفصیل دستیاب نہیں لیکن جدید مورخین عام طور پر یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور علم کی اشاعت میں دلچسپی لیتی تھیں ۲۹۔

Marfat.com

جہاں آراء (۱۶۱۴۔۱۶۸۰ء)

عہد زیر بحث کی مسلم خواتین میں شاہجہاں کی صاحبزادی جہاں آراء علم و فضل کے اعتبار سے بڑے بلند مقام پر فائز تھیں بلکہ بعض جدید مورخین کے بقول ''ہندوستان کی پوری تاریخ میں جہاں تک خواتین کا تعلق ہے علم و فضل کے لحاظ سے اعلیٰ ترین مثال جہاں آراء کی ملتی ہے'' ۳۰۔ شاہجہاں نے ان کی تعلیم کا خاص اہتمام کیا تھا اور اہم بات یہ کہ انھیں پڑھانے کے لئے ایک ذی علم خاتون صدر النساء خانم (معروف بہ ستی النساء) کو استانی یا اتالیق کے طور پر مقرر کیا تھا۔ شہزادی نے انہی سے قرآن پڑھا، علم قراءت سیکھا اور فارسی زبان و ادب میں مہارت حاصل کی ۳۱۔ فن قراءت میں مہارت کے علاوہ خطاطی میں بھی انھیں کمال حاصل تھا لیکن یہ وضاحت نہیں مل سکی کہ انھوں نے یہ فن کس سے سیکھا تھا، انکی خطاطی کے نمونے (قرآن کریم کے کچھ حصہ کی کتابت کی صورت میں) مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہیں۔ وہ مطالعہ کی بڑی شائق تھیں۔ اس کے توسط سے بھی انھوں نے اپنے علم کو ترقی دیا۔ تاریخ و سوانح سے انھیں خاص دلچسپی تھی ۳۲۔ خواجہ معین الدین چشتی کی سوانح پر ان کی فارسی تالیف ''مونس الارواح'' بہت مشہور ہے ۳۳۔ وہ شاعری کا بھی شوق رکھتی تھیں، مذکورہ کتاب میں اپنے اشعار مختلف مقامات پر نقل کیے ہیں ان سب باتوں سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم سے مزین تھیں اور انھیں مختلف علوم سکھائے گئے تھے۔

روشن آراء (م ۱۶۶۹ء)

جہاں آراء کی چھوٹی بہن روشن آراء فہم و ذکاوت اور علمی صلاحیت میں ممتاز اور پرہیزگاری، فیاضی و سادہ زندگی کے لئے معروف تھیں۔ حسب روایت شاہجہاں نے ان کی تعلیم کا بھی نظم کیا اور ستی النساء کو ان کی اتالیقہ مقرر کیا جو پہلے جہاں آراء کی

استانی رہ چکی تھیں، انھی کی رہنمائی ونگرانی میں روشن آراء نے اپنی تعلیم مکمل کی اور علم وہنر میں کمال پیدا کیا۳۴ ۔ایک روایت کے مطابق انھوں نے اورنگزیب کی صاحبزادیوں کی اتالیقی کے فرائض بھی انجام دیے۳۵۔ ان تمام باتوں سے بھی ان کے تعلیمی تجربہ کا ثبوت ملتا ہے۔

ستی النساء (صدر النساء خانم)

ستی النساء ایران کے ایک علمی خانوادہ سے تعلق رکھتی تھیں، جس میں بہت سے ادباء واطباء پیدا ہوئے عہد جہانگیری کے ممتاز فارسی شاعر طالب آملی کی بہن اور نصیرا شاعر کی اہلیہ تھیں۔ ان کی علمی صلاحیتوں اور تعلیمی تجربہ کے ثبوت کے لئے یہ بات کافی ہے کہ شاہجہاں نے اپنی دو صاحبزادیوں کی تعلیم وتربیت کے لئے انھیں منتخب کیا تھا اور انھوں نے اس کام کو بخوبی انجام دیا۳۶۔ اس کے علاوہ انھوں نے ممتاز محل کی ناظرہ (فلاحی امور کی نگراں) کے فرائض بھی انجام دیے تھے۳۷۔ گرچہ ان کی اپنی تعلیم کے بارے میں معلومات نہ مل سکیں لیکن ان کی مصروفیات اور تدریسی خدمات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ تھیں اور حفظ قرآن وفن تجوید میں مہارت کے علاوہ زباں دانی، ادبی ذوق اور تدریسی تجربہ کے لئے ممتاز تھیں۔ بعض جدید اسکالرس کے مطابق وہ طب میں بھی مہارت رکھتی تھی۳۸۔

زیب النساء (۱۶۳۸۔۱۷۰۲ء)

اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸۔ ۱۷۰۷ء) کی سب سے بڑی صاحبزادی زیب النساء اعلیٰ تعلیم یافتہ، عالمہ وفاضلہ اور علم دوست خاتون تھیں، بادشاہ نے ان کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی اور ان کے لئے یکے بعد دیگرے متعدد استانی واستاد مقرر کیے۔ شاہزادی کی تعلیم کے بارے میں نسبتاً کچھ زیادہ معلومات دستیاب ہیں۔ لیکن ان کو تعلیم دینے والوں کے سلسلہ میں جدید مصنفین کے بیانات میں اختلاف

Marfat.com

پایا جاتا ہے۔ فارسی مآخذ سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے: شہزادی کی ابتدائی تعلیم کے بعد بادشاہ نے ان کے لئے حفظ قرآن کا نظم کیا اور ایک درباری امیر عنایت اللہ خاں کشمیری کی ماں حافظہ مریم زمانی کو اس کے لئے مقرر کیا۔ (اس سے یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ امراء کے گھرانہ میں بھی حفظ قرآن کا رواج تھا) جب انھیں حفظ قرآن کی سعادت نصیب ہوگئی اور بادشاہ کو انھوں نے اپنی قراءت سے محظوظ کیا تو انھوں نے صاحبزادی کو تیس ہزار اشرفیاں بطور انعام مرحمت کیں ۳۹۔ بعد میں شہزادی کی اعلیٰ تعلیم کے لئے بادشاہ نے ایک ایرانی عالم ملا محمد سعید اشرف ماژندانی کو بطور اتالیق مقرر کیا۔ اس وقت شہزادی کی عمر تقریباً ۲۱ برس تھی ۴۰۔ جدید اہل قلم نے بغیر ماخذ کے حوالہ کے اس پر جو اضافے کیے ہیں یا ان کے علاوہ جو اطلاعات فراہم کی ہیں وہ اس طور پر ہیں: بادشاہ نے شہزادی کے لئے استانی / استاد مقرر کرنے سے قبل خود بھی انھیں پڑھایا تھا ۴۱۔ ابتدائی تعلیم ایک ایرانی خاتون کی نگرانی میں حاصل کی اور پھر دینیات کی تعلیم وحفظ کے لئے حافظہ مریم کو مقرر کیا گیا ۴۲۔ ان کی پھوپھی روشن آراء نے انھیں حافظہ کرایا ۴۳۔ ان کی اعلیٰ تعلیم کے لئے متعدد علماء مامور کئے گئے جن میں نامور عالم وممتاز مفسر ملا احمد جیون (۱۶۳۷۔ ۱۷۱۷ء) بھی شامل تھے ۴۴۔ شہزادی کے استادوں میں سب سے مشہور ملا سعید اشرف ماژندانی ہیں ۴۵۔ انھی سے حدیث وفقہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کی اور شعروشاعری میں بھی انھی سے اصلاح لی ۴۶۔ کتب درسیہ ملا احمد جیون سے پڑھیں اور شعروانشاء میں ملا محمد سعید ماژندانی سے استفادہ کیا ۴۷۔ بعض اہل قلم نے ملا جیون سے قبل ایک اور استاد (شاہ رستم غازی) سے تعلیم حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے ۴۸۔

عربی، فارسی ودینی علوم سے گہری واقفیت اور شاعری کا عمدہ ذوق رکھنے کے علاوہ زیب النساء خطاطی کی بھی ماہر تھیں اور مختلف طرز ہائے خط (نستعلیق، نسخ وشکست) سے بخوبی واقف تھیں ۴۹۔ گرچہ معاصر مآخذ میں یہ صراحت نہیں ملتی کہ انھوں نے یہ فن کس سے سیکھا تھا۔ لیکن بعض مصنفین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاید

ملا محمد سعید ماژندانی سے سیکھا تھا اس لئے کہ وہ عالم و شاعر ہونے کے علاوہ خوش نویس کی حیثیت سے بھی معروف تھے ۵۰۔ بعض جدید اسکالرس کے بیان کے مطابق وہ تاریخ، فقہ، ریاضی و ہیئت میں بھی درک رکھتی تھیں ۵۱۔

زینت النساء بیگم (۱۶۴۳۔۱۷۱۰ء)

اورنگزیب کی صاحبزادیوں میں زینت النساء بیگم بھی پڑھی لکھی و دین دار خاتون تھیں۔ بادشاہ نے ان کی تعلیم و تربیت کا بھی اہتمام کیا اور وہ علمی کمالات سے متصف ہوئیں۔ ان کے اساتذہ کے بارے میں کوئی وضاحت دستیاب نہیں۔ لیکن یہ محقق ہے کہ وہ حافظہ، عالمہ و شاعرہ تھیں ۵۲۔ مزید براں اورنگزیب کی ایک اور صاحبزادی بدر النساء بھی حفظ قرآن کی سعادت سے مشرف اور دینی تعلیم سے مزین تھیں ۵۳۔

بادشاہ و امراء کی صاحبزادیوں اور خواتین حرم اور عام عورتوں کی تعلیم سے متعلق اوپر کے مباحث سے خاص ان کی تعلیم کے طور و طریق اور اساتذہ و درسیات کے بارے میں جو معلومات سامنے آئیں انھیں مکمل و کافی نہیں کہا جا سکتا لیکن ان سے اس دور میں تعلیم نسواں کی بابت جو بعض دلچسپ و اہم حقائق آشکارا ہوتے ہیں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا خلاصہ مبحث کے طور پر ذیل میں انھیں بیان کیا جاتا ہے۔

اول یہ کہ خواتین کو اعلیٰ مرحلہ کی تعلیم شاہی محل یا ان کے گھروں پر عام طور سے انفرادی معلمات / معلمین کے ذریعہ بہم پہونچائی جاتی تھی اور اس کے لئے تین ذرائع اختیار کیے جاتے تھے۔

الف۔ والد کے ذریعہ

ب۔ گھر کی خواتین یا با مشاہرہ معلّمہ / اتالیقہ کے ذریعہ

ج۔ معلم / اتالیق کے ذریعہ

دوسرے یہ کہ اعلیٰ مرحلہ میں مختلف مضامین / فنون کے لئے مختلف استانیاں

Marfat.com

اساتذہ کی تقرری ہوتی تھی جیسا کہ اس وقت مردوں میں بھی مختلف علوم و فنون کے اکتساب کے لئے مختلف اساتذہ سے رجوع کرنے و درس لینے کا رواج تھا۔

تیسرے یہ کہ خواتین کی تعلیم کے اجتماعی نظم کی صورت میں تدریس کے فرائض انجام دینے کے لئے خواتین ہی مامور ہوتی تھیں۔

یہاں یہ ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا کہ بعض اسکالرس کا یہ تاثر ہے کہ شاہان مغل شہزادیوں کی تعلیم کے لئے ایرانی خواتین کو ترجیح دیتے تھے۵۴۔ لیکن اس کی واضح مثال صرف ایک دو ہی (مثلاً ستی النساء) ملتی ہے۔ اس ضمن میں ایک بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ شہزادیوں کی تعلیم کے لئے اگر شاہی خاندان یا امراء کی خواتین میں سے کوئی دستیاب ہوتا تو بادشاہ انہی کو ترجیح دیتے تھے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ دربار کے متعلقین کے گھرانہ میں ذی علم و باصلاحیت خواتین کی کمی نہیں تھی۔

چوتھے یہ کہ اوپر کی تفصیلات سے یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ شہزادیوں اور دوسری خواتین کو مختلف مضامین پڑھائے جاتے تھے اور بعض فن و ہنر بھی سکھائے جاتے تھے قرآن، عربی و فارسی زبان و ادب و دینیات کی تعلیم اور انشاء و خطوط نگاری کی مشق پر خاص توجہ دی جاتی تھی، خطاطی و نقاشی کی تربیت دی جاتی تھی اور ان میں شعر و ادب کا ذوق پروان چڑھایا جاتا تھا، بعض مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر وہ دینی علوم کے کسی خاص میدان میں اختصاص پیدا کرنی چاہتیں تو اس کی سہولتیں بھی میسر تھیں اور طب وغیرہ کی تعلیم حاصل کرنے کی انہیں پوری اجازت تھی۔ اس طرح ان کی درسیات کے سلسلہ میں یہ نکات بھی سامنے آئے کہ بہت سی خواتین جو اپنے گھروں میں لڑکیوں کی تعلیم کا نظم چلاتی تھیں وہ انھیں قرآن، دینیات و فارسی پڑھانے کے علاوہ بہت سے ہنر بھی سکھاتی تھیں جو امور خانہ داری کی انجام دہی کے لئے مفید و معاون بنتے تھے اور جب سلطان یا بادشاہ اپنے محل میں اجتماعی طور پر عورتوں کی تعلیم کا اہتمام کرتے تھے تو ان کے لئے زبان و ادب و مذہب کی تعلیم کے علاوہ مختلف فنون و حرفت (مثلاً زرگری، آہن گری، کوزہ گری، پارچہ بافی، مخمل بافی وسپہ

Marfat.com

گری) کی تربیت کا نظم بھی کرتے تھے۔ مزید براں معروضاتِ بالا سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ شہزادیوں کے سلسلہ میں تجوید کے ساتھ ناظرہ قرآن پڑھانے، حفظ کرانے، خطاطی کی تربیت دینے، شعری وادبی صلاحیتوں کو صیقل کرنے اور تاریخ کا شعور بیدار کرنے کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ ان سب کے علاوہ اس کے واضح ثبوت بھی ملتے ہیں کہ شاہی خاندان کی خواتین کو آدابِ سلطنت اور فنونِ حرب بھی سکھائے جاتے تھے جن میں شہ سواری، تیراندازی ونشانہ بازی کا خاص ذکر ملتا ہے۔ رضیہ سلطانہ، نور جہاں، ممتاز محل، جہاں آراء، زیب النساء وغیرہ کی سیاسی سرگرمیوں اور انتظامی وفوجی صلاحیتوں کے مظاہرہ سے ان باتوں کی توثیق ہوتی ہے۔

پانچویں یہ کہ عورتوں کی تعلیم کے انفرادی نظم کی مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اوقات انھیں پڑھانے کے لئے معلم یا اتالیق (یعنی مرد استاد) مقرر کیے جاتے تھے۔ خاص طور سے شہزادیوں کی تعلیم کے سلسلہ میں اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں۔ گرچہ مآخذ یہ وضاحت نہیں کرتے کہ معلم عورتوں کو کس طور پڑھاتے تھے یا اس طریقِ تعلیم میں عورتوں کے پردہ کا اہتمام کس طرح ہوتا تھا لیکن اس زمانہ کے لوگوں کے مذہبی رجحانات، روایتی معاشرہ کے تقاضوں اور مشرقی روایات کے پس منظر میں قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کے توسط سے عورتوں کی تعلیم پردہ کی رعایت کے ساتھ ہوتی تھی۔ دوسرے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شہزادیوں کے استاد کے طور پر معمر حضرات ہی مقرر ہوتے تھے۔ ان سب کے ساتھ یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مغل دور کی ایک پینٹنگ میں معلم کے ذریعہ ایک مغل شہزادی کو پڑھانے کی منظرکشی کی گئی ہے اس میں نہ تو شہزادی روایتی حجاب میں ہیں اور نہ ہی معلم اور شہزادی کے درمیان کوئی پردہ نظر آرہا ہے بلکہ اس میں صاف طور پر یہ دکھایا گیا ہے کہ شہزادی استاد کے روبرو بیٹھ کر ان سے درس لے رہی ہیں۔ پینٹنگ کے نیچے نہ تو شہزادی کا نام درج ہے اور نہ ان کے عہد کی نشاندہی کی گئی ہے تاہم این۔ این۔ لا (جنھوں نے اس پینٹنگ کو اپنی کتاب میں شامل کیا ہے) نے پینٹنگ کی نوعیت کی

Marfat.com

روشنی میں اسے عہد اکبری سے منسوب کیا ہے۵۵۔ لیکن صرف ایک گمنام پینٹنگ کی بنیاد پر زیر بحث مسئلہ سے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں ظاہر کی جا سکتی۔ اور اگر مغل دور سے اس کے انتساب کو صحیح بھی مان لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم کا یہ طریقہ شاہی خاندان میں رائج تھا۔ بہر حال اس ضمن میں ابھی مزید تحقیق اور قطعی شواہد کی تلاش درکار ہے۔

خلاصہ بحث کے آخر میں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ عہد اسلامی کے ہندوستان میں عورتوں کے عورتوں کو تعلیم دینے کی مثالیں بہت ملتی ہیں لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ علم قراءت کے باب میں عورتوں کے مردوں کو مستفید کرنے کی بعض مثال بھی دستیاب ہے جس کا تعلق مغل دور کے آخری حصہ سے ہے۔ ہندوستان میں قراءت کے جو طریقے رائج ہوئے ان میں ایک ''پانی پتی لہجہ'' کہلاتا ہے اور اس میں نسوانی آواز کا اثر پایا جاتا ہے اس کی اصل کے بارے میں مختلف روایتیں پائی جاتی ہیں ان میں سے ایک روایت کے مطابق مرزا مظہر جانجاناں (۱۷۰۰۔۱۷۸۱ء) کی اہلیہ پردہ میں بیٹھ کر مردوں کو بھی قرآن پڑھاتی تھیں ان کی نسوانی انداز قراءت ان کے شاگردوں میں منتقل ہوئی اور وہ بھی اسی انداز پر قرآن کی قراءت کرنے لگے اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہا اور اسی سے قراءت کے پانی پتی لہجہ کا ظہور ہوا۵۶۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ پانی پت میں علم قراءت کا آغاز قاری مصلح الدین سے ہوا تھا انہوں نے یہ فن حجاز جا کر سیکھا، بعد میں انھوں نے یہ علم اپنی صاحبزادی فضل النساء کو سکھایا۔ ان قاریہ نے عورتوں کے علاوہ مردوں کو بھی پردہ کے پیچھے سے علم قراءت کی تربیت دی اور پھر ان کے شاگردوں (جن میں قاریات وقراء دونوں شامل تھے) نے قراءت کے ایک مخصوص لہجہ کو رواج دیا جس میں نسوانی آواز غالب تھی اور رفتہ رفتہ یہ ایک مستقل لہجہ بن گیا جو ''پانی پتی لہجہ'' کہلایا۵۷۔

مختصر یہ کہ عہد اسلامی کے ہندوستان میں تعلیم نسواں نہ صرف اعلیٰ طبقہ کے لوگوں میں بلکہ عام مسلمانوں میں بھی رائج تھی۔ ابتدائی یا ضروری تعلیم کی حد تک یہ

Marfat.com

بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اس دور میں اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کی بھی کمی نہ تھی۔ اس کا ایک ثبوت شاہی محل یا بعض دوسرے مقامات پر لڑکیوں یا شہزادیوں، خواتین حرم وکنیزوں کی تعلیم کے مخصوص مراکز میں کثیر تعداد میں مقررہ استانیوں سے ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام معلمات شاہی خاندان سے تعلق نہیں رکھتی تھیں۔ جہاں تک لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے یہ مکتب یا گھریلو نظم کے ذریعہ وسیع پیمانہ پر جاری تھی لیکن ان کے علیٰحدہ مدارس یا تعلیمی مراکز نہ ہونے کی وجہ سے اعلیٰ مرحلہ میں ان کی تعلیم کے ذرائع محدود تھے اس ضمن میں سب سے مروج طریقہ استانی / استاد کے ذریعہ گھروں پر ان کی تعلیم کا اہتمام تھا۔ اس طور پر عربی وفارسی زبان وادب، اسلامی علوم اور دوسرے فنون میں مہارت حاصل کرنے یا کسی خاص مضمون میں اختصاص پیدا کرنے کی سہولتیں میسر تھیں اور خواتین ان سے مستفید بھی ہوتی رہتی تھیں جیسا کہ اس عہد کی خواتین میں قاریہ، عالمہ، فقیہہ، ادیبہ، شاعرہ، مصنفہ وطبیبہ ہونے کی متعدد مثالوں سے واضح ہوتا ہے۔ حقیقت یہ کہ پردہ عورتوں کی تعلیم میں رکاوٹ نہیں تھا بلکہ پردہ کی رعایت کے ساتھ ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی جداگانہ تعلیم گاہیں نہ ہونے کی وجہ سے ان کی اعلیٰ تعلیم کے لئے عام مسلمانوں کو کچھ دشواریاں پیش آتی تھیں۔ اسے اس وقت کے مسلم معاشرہ کی ایک کمی کہا جا سکتا ہے لیکن یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جدید ہندوستان میں لڑکیوں کے علیٰحدہ مدارس کے قیام کی تاریخ بہت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ ۱۹۵۰ء سے قبل پورے ہندوستان میں لڑکیوں کے لئے مخصوص مدارس میں ایک دو کا ہی ذکر ملتا ہے ۵۸۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلمانوں کی نظام تعلیم پر اولین انگریزی کتاب کے مصنف (N.N.Law) نے تعلیم نسواں سے بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ابتدائی عمر میں لڑکیوں کی تعلیم پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ باقاعدہ اسکول (مکتب) میں تعلیم حاصل کرتی تھیں لیکن بڑے ہونے پر پردہ ان کی تعلیم میں حارج ہوتا تھا اس لئے کہ ایک خاص عمر کے بعد وہ اسکول نہیں جا سکتی تھیں۔ ۵۹ لیکن

غالباً یہ حقیقت ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی کہ اُس دور میں اعلیٰ مرحلہ میں لڑکیوں کی تعلیم کا مروج طریقہ (جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا) یہ تھا کہ اس کے لئے ان کے گھروں پر استانیاں یا اساتذہ مقرر کیے جاتے تھے۔ اگر ہر مقام پر ان کے علیحدہ مدراس ہوتے تو یقیناً وہ مدارس سے مستفیض ہوتیں اور یہ ذکر آچکا ہے کہ اس دور میں یہ نظام شاذ و نادر ہی تھا دوسرے موجودہ دور میں مسلمانوں میں لڑکیوں کی تعلیم میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کے باوجود اب بھی ان کے روایتی طبقہ میں مخلوطہ تعلیم کے بارے میں بہت سارے تحفظات پائے جاتے ہیں اور بجا طور پر پائے جاتے ہیں، تو عہد وسطیٰ میں اس نوع کی تعلیم کا سوال کہاں پیدا ہوسکتا تھا۔ بہر حال مصنف موصوف نے عہد وسطیٰ کی خواتین بالخصوص شہزادیوں کے تعلیم یافتہ ہونے کی بہت سی مثالیں نقل کرنے کے بعد آخر میں یہ اعتراف کیا ہے کہ عہد اسلامی کے ہندوستان میں عام مسلم خواتین علم سے اتنی نابلد نہیں تھیں جتنا انھیں سمجھا جاتا ہے ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"Hence we are justified in the conclusion that the Muhammadan ladies during Muhammadan rule could not have been so ignorant as it is generally supposed.[٦٠]

مزید براں ایک ہندو مورخ (کرشن لال رائے) نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عہدِ وسطی کے ہندوستان میں مسلم خواتین کی تعلیم اتنی بے توجہی کا شکار نہیں تھی جتنی ہندو خواتین کے سلسلہ میں پائی جاتی تھی۔[٦١] ان سب حقائق سے قطع نظر پیش نظر مطالعہ سے ایک نہایت اہم نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ مسلم سلاطین و بادشاہوں نے خواتین کی تعلیم میں کافی دلچسپی دکھائی۔ یہ دلچسپی اگر شہزادیوں، خواتین حرم اور کنیزوں کی تعلیم تک محدود تسلیم کی جائے تو بھی اس اعتبار سے بہت اہم و قابل توجہ ہے کہ یہ ان حکمرانوں سے تعلق رکھتی ہے جن کے بارے میں عام طور پر یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ انھوں نے صرف شاندار عمارتیں بنوائیں، حرم سرا میں عیش و عشرت کے ایام گذارے یا جنگیں لڑنے اور ملک کے ایک طبقہ کو کچلنے میں مصروف رہے۔

☆☆☆

Marfat.com

حواشی ومراجع

۱۔ صحیح بخاری، کتاب العلم باب هل يجعل للنساء يوم على حدة في العلم

۲۔ صحابیات کے حصول علم اور اشاعت علم میں ان کی خدمات پر تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیں: عبدالسلام ندوی، اسوہ صحابیات، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۴۶ء، سید سلیمان ندوی سیرۃ عائشہ، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۶۸ء، قاضی اطہر مبارک پوری، خیرالقرون کی درسگاہیں اور ان کا نظام تعلیم وتربیت، شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند، ۱۹۹۵ء، ص ۲۵، ۶۱۔۶۴، ۱۶۲۔۱۶۵، ضیاء الدین اصلاحی، اسلام اور تعلیم نسواں معارف، ۱۷۷/۴، اپریل ۲۰۰۶ء، ص ۲۷۵۔۲۹۳

۳۔ ایس، ایم، جعفر/ مترجم: سعید انصاری، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۱۳۲، حاشیہ نمر ۲

۴۔ مسالک الابصار، محولہ بالا، ص ۴۱

۵۔ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، محولہ بالا، ص ۱۳۶، سعید احمد رفیق، اسلامی نظام تعلیم، کراچی (بدون تاریخ) ص ۲۳۰ **Krishnalal Ray**, *Education in Medieval India*, Delhi,1984,P.91

۶۔ اسلامی نظام تعلیم، ص ۲۳۰۔۲۳۱، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص ۱۳۵، **Jafar Sharif**,*Qanoon-i- Islam-the Customs of Musalmans of India*,New Delhi, 1972,P.52, N.N Law, PP.200-201

۷۔ اکبرنامہ، ۲۷۰/۱، اکبر نامہ، ۶۰۴/۳، منتخب التواریخ، ۱۷۰/۲، شاہجہاں نامہ (مخطوطہ) ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ، کلکتہ) ورق ۱۵ (بحوالہ این این لا، ص ۱۲۸)

۸۔ رحلہ ابن بطوطہ، ص ۵۵۴، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص ۵۸۔۵۹، ۱۳۴

۹۔ تاریخ فرشتہ، ۲۵۵/۲

۱۰۔ این۔ این۔ لا، ص ۹۷۔۹۸

Marfat.com

۱۱۔ تاریخ فرشتہ ۲/ ۲۵۵، اسلامی نظام تعلیم، ص ۱۱۸ **Yusuf Husain**, *Glimpses of Medieval Indian Culture*, Bombay 1959,P.92

۱۲۔ این ۔ این ۔ لا، ص ۲۰۳، بحوالہ **Smith**, *Architecture at Fathpur Sikri*, Pt.1, P.8

۱۳۔ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں ص ۱۳۵

۱۴۔ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۹۵، ۱۰۳۔ اس موضوع پر تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیں تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں ص ۱۱۳۔۱۳۲، کرشن لال رائے، ص ۹۳۔۱۰۳

۱۵۔ طبقات ناصری، ص ۱۸۵۔۱۸۶، فرشتہ، ۶۸/۱

۱۶۔ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص ۱۱۴، این این لا، ص ۲۱

۱۷۔ تاریخ فرشتہ، ۶۸/۱

۱۸۔ طبقات ناصری ص ۶۷۰، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص ۱۱۴، شرف النسا، ۲۰۱/۱

۱۹۔ اقتدار حسین صدیقی محولہ بالا مضمون مطبوعہ ہمدرد اسلامکس، ص ۶۳، بحوالہ نعمت اللہ ہروی، تاریخ خان جہانی، ۸۲۸/۲۔

۲۰۔ حوالہ مذکور، ص ۶۳

۲۱۔ **Gulbadan Bagum**/ Eng.Tr. A.S. Beveridge, *The History of Humayun(Humayun Nama)* (Eng. Tr with Persian text) New Dilhi, 1972,PP.8-9 **Zinat Kausar**,*Muslim Women in Medieval India*, New Delhi,1992,PP 150-151

صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم تیموریہ، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۸۱ء، ۲۳۷/۳، محمد اسلم جیراج پوری (مرتب) خواتین، سنگم کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۱ء، ص ۱۸۳

Marfat.com

۲۲۔ ہمایوں نامہ (اُردو ترجمہ: عثمان حیدر مرزا) مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۳۵ء،
ص ۱۳، بزم تیموریہ، ۲۳۷/۳

۲۳۔ مقالات شبلی، ۶۰/۴۔۶۱

۲۴۔ تزک جہانگیری، ص ۱۱۴، منتخب التواریخ، ۳۷۷/۲، اکبر نامہ، ۶۵/۲، این۔این۔لا، ص ۲۰۲،
تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص ۱۳۷، بزم تیموریہ، ۲۴۱/۳۔۲۴۲

۲۵۔ اکبر نامہ، ۸۱۵/۳، بزم تیموریہ، ۲۴۱/۳، اسمتھ محولہ بالا، ص ۳۱۰

۲۶۔ عنایت عارف، شرف النساء، مکتبہ علمیہ، لاہور (بدون تاریخ) ۲۳۴/۱، Beni prasad,
Histoy of Jahangir, Allahabad 1973, PP. 156-158, 160,169

۲۷۔ این۔این۔لا، ص ۲۰۲، کوثر، ص ۱۵۷

۲۸۔ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص ۱۳۸، اسلامی نظام تعلیم، ص ۲۳۸
زینت کوثر، ص ۱۵۸

۲۹۔ بزم تیموریہ، ۲۴۹/۳ خواتین، محولہ بالا، ص ۲۳۵

۳۰۔ ایس، ایم، جعفر، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص ۱۳۸

۳۱۔ بادشاہ نامہ، ۶۲۹/۲

۳۲۔ این۔این۔لا، ص ۲۰۳، اسلامی نظام تعلیم، ص ۲۳۸۔۲۳۹، Kabir Kausar,
Biographical Dictionary of Prominent Muslim Ladies,
New Delhi, 1982, PP. 138- 139

۳۳۔ مونس الارواح کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم (لندن) میں محفوظ ہے۔

۳۴۔ خواتین، محولہ بالا (مضمون محبوب الرحمٰن وکیل: روشن آرا بیگم) ص ۲۴۸۔۲۴۹

۳۵۔ سعید احمد رفیق، اسلامی نظام تعلیم، ص ۲۴۱

۳۶۔ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص ۱۳۹، مآثر الامرا، ۷۹۰/۲، مآثر

Marfat.com

الکرام، ۲/۴۴

۳۷؎ مآثر الکرام، ۲/۴۴، بزم تیموریہ، ۳/۲۴۹، این۔این۔لا، ص ۲۰۴

۳۸؎ مآثر الامراء، ۲/۹۰۷۔۹۱۷، سعید احمد رفیق، اسلامی نظام تعلیم، ص ۲۴۲، بزم تیموریہ، ۳/۲۴۹

۳۹؎ مآثر الامراء، ۲/۸۲۸۔۸۲۹، مآثر عالمگیری، ص ۵۳۸

۴۰؎ مآثر الکرام، ۲/۱۱۲

۴۱؎ این۔این۔لا، ص ۲۰۴

۴۲؎ کبیر کوثر، محولہ بالا، ص ۳۹۴۔۳۹۵

۴۳؎ شرف النساء، ص ۲۳۹، زینت کوثر، ص ۱۶۱

۴۴؎ حوالہ مذکور، ص ۲۳۹

۴۵؎ مقالات شبلی، جلد پنجم (تاریخی۔ حصہ اول)، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۳۶ء (مقالہ: زیب النساء)، ص ۱۰۷۔۱۰۸

۴۶؎ بزم تیموریہ، ۳/۲۵۷

۴۷؎ اشفاق علی، ملا جیون کے معاصر علماء، نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص ۸۴

۴۸؎ زینت کوثر، ص ۱۶۱

۴۹؎ مآثر عالمگیری، ص ۵۳۸۔۵۳۹، مقالات شبلی، ۵/۱۰۴، اسلامی نظام تعلیم، ص ۲۴۲

۵۰؎ بزم تیموریہ، ۳/۲۵۷

۵۱؎ زینت کوثر، ص ۱۶۲

۵۲؎ مآثر عالمگیری، ص ۵۳۹ بزم تیموریہ، ۳/۲۶۵

۵۳؎ مآثر عالمگیری، ص ۵۳۹۔۵۴۰، بزم تیموریہ، ۳/۲۶۶

۵۴؎ سعید احمد رفیق، اسلامی نظام تعلیم، ص ۲۳۲

۵۵؎ این۔این۔لا، ص ۲۰۶

۵۶ قاری احمد میاں تھانوی۔ انٹرویو، ماہنامہ التجوید (فیصل آباد۔ پاکستان) شمارہ ۹۸، جنوری۔فروری ۲۰۰۶ء ، ص ۱۷

۵۷ قاری محمد طاہر، پاکستان میں علم تجوید وقراءت۔ ماضی، حال، مستقبل (غیر مطبوعہ پی، ایچ ڈی مقالہ) ادارہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۹۷ء، ۲/ ۳۹۹

۵۸ محمد قمر الحق، ہندوستان کے اہم مدارس۔ ایک سروے رپورٹ، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۶۲، **Ziyaudddin Desai,** *Centres of Islamic Learning in India*, New Delhi,1978,P.61

۵۹ این۔این۔لا، ص ۲۰۰

۶۰ حوالہ مذکور، ص ۲۰۵

۶۱ کرشن لال رائے، محولہ بالا، ص ۸۶

باب پنجم

مدارس کے قیام اور علم کی اشاعت میں خواتین کی دلچسپیاں

عہد اسلامی کے ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم کا کیا نظام رہا ہے، ان کی درسیات کیا تھیں اور ان کی تعلیم و تربیت کے لئے کیا سہولیات مہیا تھیں، یہ مسائل خود اپنی جگہ پر بہت اہم ہیں اور سابق باب میں ان پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اسی ضمن میں یہ مطالعہ بھی کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں کہ اس دور میں خود عورتوں نے مدارس کے قیام اور علم کی اشاعت میں کس حد تک دلچسپی لی اور مختلف علوم وفنون کے فروغ کے لئے انھوں نے کیا خدمات انجام دیں۔ اس موضوع پر خاطر خواہ مواد دستیاب نہیں ہو سکا۔ لیکن جو کچھ معلومات فراہم ہوئی ہیں ان سے بعض اہم و دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں۔ یہ بات گرچہ تعجب خیز معلوم ہوتی ہے لیکن بڑی اہم ہے کہ وہ دور جس کے بارے میں یہ عام تاثر پایا جاتا ہے کہ اس میں خواتین کی تعلیم پر بہت کم توجہ دی گئی، ان کی تعلیم کے لئے مخصوص مدارس یا ادارے شاذ و نادر ہی قایم کیے گئے اس سے متعلق یہ ثبوت ملتا ہے کہ خود خواتین نے متعدد مدارس قایم کیے اور ان کی توسیع و ترقی پر توجہ دی۔ اسی طرح اس کے شواہد بھی دستیاب ہیں کہ اس زمانہ کی خواتین نے علم کی اشاعت کے دوسرے ذرائع بھی اختیار کیے ان میں کتب خانہ اور دار الترجمہ والتصنیف کا قیام، اہل علم کی سرپرستی و حوصلہ افزائی، مختلف موضوعات پر کتابوں کی تصنیف و تالیف اور علمی و ادبی مجالس کی سرگرمیوں کا فروغ شامل ہے۔

رضیہ سلطانہ اور مدرسہ معزی و ناصریہ (دہلی):

عہد اسلامی کے ہندوستان کی اولین خاتون حکمراں رضیہ سلطانہ (جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے) نہ صرف تعلیم یافتہ بلکہ علم دوست خاتون تھیں۔ گرچہ اس بات کا

Marfat.com

کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا کہ انھوں نے کوئی مدرسہ قایم کیا ہو لیکن معاصر مورخین اس کی شہادت دیتے ہیں کہ جو مدارس پہلے سے موجود تھے ان کی توسیع و ترقی اور ان کے نظم و نسق کو بہتر بنانے میں خصوصی دلچسپی لی۔ اس کا مظاہرہ خاص طور سے مدرسہ معزی و مدرسہ ناصریہ کے ضمن میں ملتا ہے۔ انہی کی ایماء پر اس وقت کے مشہور عالم و مورخ قاضی منہاج السراج نے مدرسہ ناصریہ کی نگرانی کی ذمہ داری قبول کی اور اپنے حسن انتظام سے اسے ترقی دیا۔ اسی طرح سلطان التمش کے قائم کردہ مدرسہ معزی کو ترقی دے کر رضیہ سلطانہ نے اسے ایک عظیم الشان درسگاہ بنا دیا تھا جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے۔

مدرسہ راجی بیگم (جونپور)

ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں کسی خاتون کے ذریعہ مدرسہ کے قیام کی اولین مثال جونپور سے متعلق ملتی ہے۔ یہ بات معروف ہے کہ دہلی سلطنت کے آخری دور میں مشرقی یوپی میں ''شرقی سلطنت'' کے نام سے ایک آزاد ریاست قایم تھی جس کا پایۂ تخت جونپور تھا، عہد وسطی میں جونپور اور آس پاس کے علاقوں کی بیشتر علمی و ادبی سرگرمیاں اسی دور کی یادگار ہیں۔ اس دور کے حکمرانوں (جنھیں شرقی سلاطین کہا جاتا تھا) میں شاہ محمود (۱۴۴۰۔ ۱۴۵۷ء) بھی شامل تھے۔ ان کی اہلیہ راجی بیگم (جو بی بی راجی اور راجہ بی بی کے نام سے بھی معروف تھیں) نے ۱۴۵۲ء میں جونپور میں ایک مدرسہ قایم کیا تھا جو ''مدرسہ راجی بیگم'' کے نام سے مشہور ہوا۔ رضیہ سلطانہ کی طرح راجی بیگم بھی تعلیم یافتہ، بڑی ذہین اور دانشمند خاتون تھیں۔ وہ حکمراں نہیں تھیں لیکن ان کی صلاحیت اور سوجھ بوجھ سے ان کے شوہر شاہ محمود فائدہ اٹھاتے تھے اور بہت سے امور سلطنت ان کی معاونت سے انجام دیتے۔ راجی بیگم نے دینی، تعلیمی اور رفاہی امور میں بھی دلچسپی لی، انہی کی فرمائش پر جونپور میں لعل دروازہ کے قریب ''نماز گاہ'' کے نام سے ایک محل تعمیر کرایا گیا۔ اس عمارت کا امتیاز یہ تھا کہ اس میں

مدرسہ، مہمان خانہ، حوض اور باغ سب کچھ تھا۔ اس مدرسہ کے اساتذہ میں وقت کے مشہور علماء شامل تھے اور ملک کے مختلف حصوں کے طلبہ یہاں تعلیم حاصل کرتے تھے، انہیں قیام کی سہولتیں حاصل تھیں اور وظائف بھی دیے جاتے تھے۔ سلطان بہلول لودی کے زمانہ (۱۴۱۵۔۱۴۸۹ء) تک اس مدرسہ کے جاری رہنے کا ثبوت ملتا ہے۲۔ بعض جدید مورخین کے بیان کے مطابق راجی بی بی نے ۱۴۴۱ء میں جونپور میں خاص لڑکیوں کے لئے بھی ایک مدرسہ قایم کیا تھا۳۔ کسی معاصر ماخذ سے اس بیان کی تصدیق نہ ہوسکی۔

مدرسہ خیر المنازل (قایم کردہ ماہم انگہ (دہلی)

اکبر کی رضاعی ماں اور ایک باثر امیر ندیم کوکا کی اہلیہ ماہم انگہ کے بارے میں پہلے یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ اور علم کی دلدادہ تھیں، عہد اکبری میں حرم کی نگراں تھی اور سیاسی اثر و رسوخ کی مالک تھیں۴۔ علمی و دینی کاموں میں بھی ان کی کچھ دلچسپی ظاہر ہوئی۔ اس کا واضح ثبوت مدرسہ '' خیر المنازل'' اور اس سے متصل ایک مسجد کے قیام کی صورت میں ملتا ہے۔ انھوں نے یہ مدرسہ دہلی میں پرانے قلعہ (معروف بہ ''دین پناہ'') کے قریب ۹۶۹ھ/ ۱۵۶۱ء میں تعمیر کرایا تھا اور اسی سے متصل ایک مسجد بھی بنوائی تھی۔ یہ عمارت جو پوری طرح چونے و پتھر سے بنی ہوئی تھی بڑی شاندار اور بیل بوٹوں سے مزین تھی ۵۔ اس مدرسہ کا تاریخی نام '' خیر المنازل'' ہے جیسا کہ اس پر نصب کردہ کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ قطعۂ تاریخ کا آخری شعر یہ ہے:

زہے خیریت ایں خیر منزل ‌ ‌ ‌ کہ شد تاریخ او'' خیر المنازل'' ۶
۹۶۹ھ

معاصر مورخین میں ابوالفضل اور عبدالقادر بدایونی نے اس مدرسہ کا ذکر '' مدرسہ ماہم انگہ'' اور '' مدرسہ بیگم'' کے نام سے کیا ہے ۷۔ لیکن جیسا کہ مذکورہ کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے اس کا تاریخی نام '' خیر المنازل'' تھا۔ مزید براں ماہم انگہ کے بارے میں یہ ذکر بھی ملتا ہے کہ انھوں نے اس مدرسہ کے لئے تمام ضروری اسباب و وسائل

Marfat.com

مہیا کیے اور باصلاحیت اساتذہ کی تقرری کا اہتمام کیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے مدرسہ محض اپنے تعمیری ذوق کی تسکین کے لئے نہیں بلکہ تعلیم کی اشاعت کے لئے تعمیر کرایا تھا۸۔ یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ بابر کی اہلیہ یعنی اکبر کی دادی کا نام ''ماہم بیگم'' تھا، بعض جدید اہل قلم نے مدرسہ ''خیر المنازل'' کی تعمیر بابر کی اہلیہ سے منسوب کی ہے جو صحیح نہیں ہے۹۔

مدرسہ بیگا بیگم (دہلی):

بیگا بیگم جو دو بار حج سے مشرف ہوئیں حاجی بیگم کے نام سے بھی معروف تھیں یہ بادشاہ ہمایوں کے ازواج میں سے تھیں اور اصلاً کابل کی رہنے والی تھیں۔ بابر کی وفات کے بعد ہندوستان آئیں اور دیگر مصروفیات کے ساتھ انھوں نے علم کی اشاعت میں بھی دلچسپی لی۔ اپنے شوہر کی معزولی وجلاوطنی کے بعد ۱۵۴۵ء میں یہ دوبارہ کابل منتقل ہوگئیں اور ۱۵۵۷ء میں ہندوستان واپس آئیں، بادشاہ اکبر انکی بڑی عزت کرتے تھے اور ماں کی طرح انھیں مانتے تھے۔ انھوں نے دہلی میں ہمایوں کا مقبرہ بنوایا اور اسی کے قریب ایک مدرسہ بھی قایم کیا۔۱۰

مدرسہ لاڈو (لاہور):

یہ بات بری دلچسپ واہم ہے کہ اکبر کی طرح جہانگیر کی رضاعی ماں دائی لاڈو بھی تعلیم کی اشاعت کی جانب راغب ہوئیں۔ ان سے لاہور میں ایک مدرسہ کا قیام منسوب ہے۔ اس سے ملحق انھوں نے ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ مدرسہ کے نظم ونسق کی ذمہ داری مولانا عصمت اللہ کے سپرد کی تھی۔ یہ مدرسہ مغل دور کے آخری حصہ تک باقی رہا۔۱۱

مدرسہ اکبر آبادی بیگم (دہلی):

شاہجہاں کی بیگمات میں ممتاز محل تاج محل کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ لیکن یہ بات کم ہی لوگوں کے علم میں ہوگی کہ ان کی بیگمات نے علم کی اشاعت

Marfat.com

میں بھی دلچسپی لی بعض نے غریب طلبہ و طالبات کے لئے وظائف جاری کیے اور بعض نے باقاعدہ مدارس تعمیر کرائے۔ شاہجہاں کی اہلیہ نواب اعزاز النساء بیگم عرف اکبرآبادی بیگم (م ۱۶۶۷ء) مسجد و مدرسہ کی تعمیر اور دوسرے رفاہی کاموں کی انجام دہی کے لئے معروف تھیں۔ دہلی سے چند میل کے فاصلہ پر ایک نہر (جو نہر اکبرآبادی کہلاتی تھی) کھدوائی اور ۱۰۶۰ھ/ ۱۶۵۰ء میں دارالسلطنت کے فیض بازار میں ایک شاندار مسجد اور مدرسہ تعمیر کرایا جس پر ڈیڑھ لاکھ سے زائد روپیے صرف ہوئے۔ یہ مدرسہ اقامتی تھا اور اس میں طلبہ و مدرسین دونوں کے لئے رہائشی کمرے بنے ہوئے تھے۱۲۔ ایک روایت کے مطابق شاہ عبدالقادر دہلویؒ (م ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۵ء) کافی عرصہ تک مسجد کے ایک حجرہ میں مقیم رہے۔ وہ مدرسہ میں طلبہ کو درس دیتے رہے اور دیگر شائقین علم کو بھی فیض یاب کرتے رہے۔ یہاں ان سے مستفید ہونے والوں میں شاہ اسمٰعیل شہید دہلویؒ، مولانا فضل حق خیرآبادیؒ اور مولانا اسحاق دہلویؒ شامل تھے۱۳۔ یہ مدرسہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کی انتقامی کاروائی کی نذر ہو گیا۔

مدرسہ فتح پوری بیگم (دہلی)

شاہجہاں کی دوسری اہلیہ فتح پوری بیگم کا قایم کردہ مدرسہ زیادہ مشہور ہے۔ انھوں نے اسے ۱۰۶۰ھ/ ۱۶۵۰ء میں دہلی میں مسجد فتح پوری سے متصل بنوایا تھا۔ اس میں بھی طلبہ و اساتذہ کے لئے رہائش کا معقول انتظام تھا۔ اس سے ملحق دکانیں بنی ہوئی تھیں جن کی آمدنی مسجد و مدرسہ کے لئے وقف تھی۱۴۔ مصنف ''آثار الصنادید'' کی تصریح کے مطابق مسجد فتح پوری میں صحن کے گرد ۶۹ کمرے طلبہ کے رہنے کے لئے بنے ہوئے ہیں۱۵۔

مدرسہ جہاں آرا (آگرہ):

شاہجہاں کی بیگمات کے علاوہ ان کی صاحبزادی جہاں آرا بھی تعمیری ذوق، علمی شوق اور مذہبی کاموں کے لئے معروف تھیں۔ آگرہ کی جامع مسجد کے ساتھ ایک

Marfat.com

مدرسہ ان کی یادگار ہے۔ انھوں نے یہ مدرسہ قلعہ کے بالمقابل تعمیر کرایا تھا۔ اس کے لئے زمین بھی وقف کی تھی جہاں دکانیں بنائی گئیں اور ان کی آمدنی مسجد و مدرسہ کے لئے وقف ہوئی۔ یہ مدرسہ کافی عرصہ تک علم دین کی اشاعت میں مصروف رہا۔[۱۶]

مدرسہ حیات النساء (حیات آباد، حیدرآباد)

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں جنوب کی آزاد مسلم ریاستوں میں گولکنڈہ کی قطب شاہی ریاست کافی مشہور ہے جو ۱۵۱۸ء سے ۱۶۸۷ء تک قائم رہی اس دور کے سلاطین میں عبداللہ قطب شاہ (۱۶۲۶۔۱۶۳۶ء) کی والدہ حیات بخشی بیگم (معروف بہ حیات النساء) علمی لیاقت، انتظامی صلاحیت اور رفاہی امور میں دلچسپی کے لئے بڑی شہرت کی مالک تھیں۔ اپنے بیٹے عبداللہ قطب شاہ کی سلطنت کے اولین دور میں (جبکہ وہ کم عمر تھے) حکومت کا کام وکاج اصلاً وہی انجام دیتی تھیں انہوں نے ۱۶۲۶ء میں حیدرآباد سے تقریباً چھ میل کے فاصلہ پر ''حیات'' آباد'' کے نام سے ایک قصبہ آباد کیا۔ اس میں محل، مسجد، سرائے کے ساتھ ساتھ ایک مدرسہ بھی تعمیر کرایا۔ وہ تاحیات اس مدرسہ کی مالی اعانت بھی کرتی رہیں یہ مدرسہ قطب شاہی ریاست کے خاتمہ تک باقی رہا۔ حیات آباد کی آبادکاری اور اس کی تمدنی وثقافتی ترقی کے لئے حیات النساء (م ۱۶۷۲ء) کی خدمات بڑی اہم وقابل قدر رہی ہیں جن کا اعتراف قدیم وجدید تمام مورخین کے یہاں ملتا ہے[۱۷]۔

مدرسہ والدہ غازی الدین خاں (دہلی)

مغلیہ سلطنت کے آخری حصہ میں احمد شاہ (۱۷۴۸۔۱۷۵۴ء) اور عالمگیر ثانی (۱۷۵۴۔۱۷۵۹ء) کے عہد میں غازی الدین خاں فیروز جنگ وزیر کے عہدہ پر فائز رہے ہیں۔ انکی والدہ (بنت وزیر قمر الدین خاں اعتماد الدولہ) تعلیم کی اشاعت میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ انھوں نے اسی مقصد سے دہلی میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔

Marfat.com

مولانا فخر الدین دہلوی (م ۱۷۸۴ء) جو تصوف سے بھی شغف رکھتے تھے ایک طویل عرصہ تک اس مدرسہ میں سکونت پذیر رہے اور طلبہ کو اپنے درس سے اور دوسروں کو ارشاد و تلقین سے مستفیض کرتے رہے۔ اسی وجہ سے یہ بعد میں مدرسہ مولانا فخر الدین دہلوی کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔[۱۸]

اوپر کی تفصیلات سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ عہد اسلامی کے ہندوستان میں متعدد خواتین نے مدارس قائم کیے اور ان کی توسیع و ترقی پر بھی توجہ صرف کی۔ اس کے علاوہ اس ضمن میں اس دور کی ان خواتین کا ذکر پہلے آ چکا ہے جنہوں نے تدریس کو مشغلہ کے طور پر اختیار کیا اور بناتِ اسلام کو تعلیم سے آراستہ کرنے میں پوری دلچسپی لی۔ عہد زیر بحث میں خواتین نے علم کی اشاعت کے لئے درس و تدریس کے علاوہ دوسرے ذرائع بھی اختیار کیے۔ ان میں تصنیفی و تالیفی سرگرمیاں، کتب خانے کا قیام، اصحاب علم کی سرپرستی و حوصلہ افزائی اور طلبہ، اساتذہ و اہل قلم کو وظائف و عطایا سے نوازنا شامل تھا۔ ذیل میں اس پہلو سے بھی خواتین کی دلچسپیوں اور خدمات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں بھی یہ احساس غالب ہے کہ دستیاب معلومات زیادہ تر شہزادیوں اور شاہی خاندان کی عورتوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

تصنیف و تالیف کے میدان میں گلبدن بیگم کا خاص کارنامہ "ہمایوں نامہ" ہے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ تصنیف و تالیف سے انھیں خاص شغف تھا، جو کچھ وقت بچتا وہ اسی کام میں صرف کرتیں، گرچہ انھوں نے یہ تاریخی مرقع اکبر کی فرمائش پر مرتب کیا تھا لیکن اس سے بہر حال یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ تاریخی ذوق رکھتی تھیں اور تحریری صلاحیت سے متصف تھیں، علامہ شبلی نے اپنے ایک مقالہ میں "ہمایوں نامہ" کے مشتملات کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور زبان و بیان، مواد، انشاپردازی و منہج تاریخ نگاری کے اعتبار سے اس کتاب کو قابل قدر قرار دیا ہے۔ ان کے تاثرات ملاحظہ فرمائیں:

"سب سے پہلے ہم کو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ گلبدن بیگم کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب تیموری سلطنت کی بنیاد قائم ہو رہی تھی۔ ایسے ابتدائی زمانہ میں

Marfat.com

مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کی یہ حالت تھی کہ بیگمات ایسی تصنیف کرتی تھیں جو آج مردوں سے بن نہیں آسکتیں۔ فارسی زبان میں سادہ وصاف واقعہ نگاری کا عمدہ سے عمدہ نمونہ تزک جہانگیری اور رقعات عالمگیری میں ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمایوں نامہ کچھ ان سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے۔'' [19]

اسی طرح مولفہ کی تاریخ نگاری کے وصف کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ شاہی خاندان کی ناز پروردہ خاتون تاریخ نویسی کے فرض اور ذمہ داری سے کس قدر واقف ہے۔ اس نے یہ کتاب اپنی مرضی سے نہیں لکھی اور شاید لکھنا پسند بھی نہ کرتی لیکن شاید اکبر اعظم کی فرمائش ٹالی نہیں جا سکتی تھی اس نے تعمیل حکم کی تاہم فرائض تاریخ نویسی کے لحاظ سے سب سے پہلے یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتی تھی'' (کہ بابر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ سماعت وحافظہ پر مبنی ہے) [20]۔

گلبدن بیگم کی تالیف کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے مغل دور کی معاشرتی و تمدنی زندگی اور خاص طور سے عورتوں کی سماجی وعلمی زندگی کے بارے میں بہت سی نئی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ مزید براں ملکی وانتظامی امور میں ان سے مشورہ لینے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ واقعہ یہ کہ اس کتاب سے عورتوں کی معاشرتی زندگی کی نئی جہتیں سامنے آئیں اور فن تاریخ نگاری کو ایک نیا رخ ملا جو یقیناً گلبدن بیگم کی ایک مفید علمی خدمت تھی، اس کے علاوہ وہ شاعرانہ ذوق رکھتی تھیں اور اس میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ عہد اکبری میں عبدالرحیم خانخاناں کی صاحبزادی اور شہزادہ دانیال کی اہلیہ جاناں بیگم علمی ذوق کی مالک تھیں، انھوں نے تصنیف وتالیف کے میدان میں دلچسپی لی اور فارسی میں قرآن کی تفسیر لکھی۔ اس تفسیر کی تکمیل پر بادشاہ نے انھیں پچاس ہزار دینار بطور انعام مرحمت کیے تھے [21]۔ اس سے اس تفسیر کی قدر وقیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جاناں بیگم شاعری کا شوق بھی رکھتی تھیں ان کی شاعری کے نمونے بعض کتابوں میں ملتے ہیں [22]۔

شاہجہاں کی صاحبزادی جہاں آرا اپنی علمی دلچسپیوں کے لئے مشہور ہیں وہ

Marfat.com

مطالعہ کی بڑی شایق تھیں بالخصوص بزرگانِ دین وصوفیاء کے احوال پر کتابیں پڑھتی تھیں۔ وہ ان باصلاحیت مغل شہزادیوں میں شامل ہیں جو صاحبہ تصنیف تھیں۔ انھوں نے خاص طور سے سوانح نگاری میں دلچسپی لی اور اس موضوع پر دو کتابیں تالیف کیں، ممتاز چشتی صوفیاء کے تذکرہ پر ان کی فارسی کتاب ''مونس الارواح'' بہت معروف ہے۔ اسے انھوں نے ۲۶ برس کی عمر میں ۱۶۳۹ء میں مکمل کیا۔ اس میں انھوں نے شیخ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے حالات بہت تفصیل سے اور عقیدت مندانہ انداز میں بیان کیے ہیں خود ان کے اپنے بیان کے مطابق اس کتاب کی تالیف میں انھوں نے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے اور واقعات نقل کرنے میں صحت کا خاص خیال رکھا ہے۲۳۔ علامہ شبلی نے ''الندوہ'' کے اپریل ۱۹۱۱ء کے شمارے کے شذرات (اداریہ) میں زبان وبیان کے اعتبار سے اس کتاب کی تعریف کی ہے اور اس کی عبارت کو صاف وشستہ قرار دیا ہے۲۴۔ اس کے علاوہ ''صاحبیہ'' کے نام سے ایک رسالہ بھی جہاں آرا سے منسوب ہے جو ان کے مرشد ملا شاہ بدخشانی کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ احمد آباد میں محفوظ ہے ۲۵۔ جہاں آرا شعروشاعری کا عمدہ ذوق رکھتی تھیں، ''مونس الارواح'' میں جابجا اپنے اشعار نقل کیے ہیں ۲۶۔ ان کے اشعار میں اخلاقی ومذہبی اقدار کی ترجمانی ملتی ہے جو یقیناً قابل قدر ہے تذکرہ کی کتابوں میں نثر ونظم کا ملا جلا نمونہ ایک منفرد اسلوب نگارش ہے جسے اس علم دوست شہزادی نے ترقی دیا۔

مغل شہزادیوں میں زیب النساء اپنے علم وفضل اور علمی ودینی خدمات کے لئے سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ اورنگزیب نے جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا شہزادی کی تعلیم وتربیت کا خصوصی اہتمام کیا تھا جس کی بدولت وہ عربی وفارسی زبان، قرآن، حدیث، فقہ اور شعروادب کی عالمہ بن گئی تھیں، ''بزم تیموریہ'' کے مصنف گرامی نے بجا فرمایا ہے کہ ''تیموری شہزادیوں کے علمی چمنستان کا گل سرسبد زیب النساء ہے'' ۲۷ تصنیف وتالیف کے میدان میں ان کی کئی قیمتی یادگاریں ہیں۔ انھوں نے خود اپنی نگرانی وسرپرستی میں دو کتابیں (زیب التفاسیر وانیس الحجاج) تالیف کرائیں جو بڑی

Marfat.com

اہمیت کی حامل ہیں۔ دونوں ملا صفی الدین اردبیلی کشمیری کی تالیف کردہ ہیں۔ اول الذکر امام رازی کی تفسیر کبیر کا فارسی ترجمہ ہے جو ۱۶۷۶ء میں مکمل ہوئی اور متعدد جلدوں پر مشتمل ہے [۲۸]۔ اس کی پانچویں جلد کا قلمی نسخہ بوڈلین لائبریری، آکسفورڈ میں محفوظ ہے جس پر خاتمہ کی تاریخ ۱۰۸۱ھ/۱۶۷۰ء لکھی ہوئی ہے [۲۹]۔ دوسری کتاب حج کا سفرنامہ ہے جسے صفی الدین نے حج سے واپسی پر شہزادی کی فرمائش پر مرتب کیا تھا۔ یہ حج کے سفر، مقامات و تجربات پر بڑی مفید و قیمتی معلومات کا خزانہ ہے [۳۰]۔ زیب النساء کی ایک اور تالیف ''زیب المنشآت'' کے نام سے معروف ہے۔ یہ ان کے خطوط و رقعات کا مجموعہ ہے [۳۱]۔ شہزادی شعر و شاعری سے بھی شغف رکھتی تھیں۔ ''دیوان مخفی'' کے نام سے ایک مجموعۂ کلام بھی ان سے منسوب کیا جاتا ہے گرچہ اس کی صحت و استناد محققین کے مابین مختلف فیہ ہے [۳۲]۔ اس طرح ترجمہ و تصنیف کے کاموں میں زیب النساء کی دلچسپی و سرپرستی بڑی مفید علمی خدمات میں منتج ہوئی اور یہ بالآخر مختلف علوم و فنون کی اشاعت کا ذریعہ بنیں۔

علم کے فروغ میں کتب خانے و لائبریری کی اہمیت محتاج بیان نہیں۔ طالبان علم و اہل قلم کے لئے یہ رگِ جاں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عہد زیر بحث میں شاہی محل میں کتب خانہ کا قیام، کتابوں کی فراہمی، قیمتی کتب کی نقول کی تیاری اور خاص خاص موقعوں پر اہل علم میں کتابوں کی تقسیم بادشاہوں کی علمی دلچسپیوں کا حصہ رہا ہے [۳۳]۔ اہم بات یہ ہے کہ اس باب میں امراء، شہزادوں و شہزادیوں اور بیگمات کی دلچسپی کے مظاہر بھی ملتے ہیں۔ بعض شہزادیاں کتابیں جمع کرنے اور اُن کی دیکھ ریکھ کا خاص شوق رکھتی تھیں، دوسروں کو ان سے استفادہ کا موقع بھی دیتی تھیں۔ مغل خواتین میں یہ روایت گلبدن بیگم نے قایم کی تھیں انھیں کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا یہی شوق آگے بڑھ کر ایک کتب خانے کے قیام کا موجب بنا جس کا ذکر معاصر مآخذ اور بعض دوسری کتابوں میں ملتا ہے [۳۴]۔ شہزادی کے اس شوق کا ایک ثبوت یہ بھی دستیاب ہے کہ بادشاہ اکبر نے ایک دفعہ بایزید کے ہمایوں نامہ (تذکرہ ہمایوں و اکبر) کی

Marfat.com

نو کا بیان نقل کرائیں ان میں سے ایک گلبدن کو بھی بھیجا ۳۵۔ بابر کی نواسی وگلرخ کی صاحبزادی سلطان سلیمہ بیگم (جو اکبر کی ازواج میں سے تھیں) کو کتب بینی کا کافی شوق تھا۔ انھوں نے ایک ذاتی لائبریری قایم کررکھی تھی اور شاہی لائبریری سے بھی فائدہ اٹھاتی تھیں، بدایونی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''خرد افزا'' (سنگھاسن بتیسی کا فارسی ترجمہ از عبدالقادر بدایونی) نامی کتاب سلیمہ بیگم کے زیر مطالعہ تھی، ایک دفعہ وہ کتب خانہ سے غائب ہوگئی تو بادشاہ نے اس کی دستیابی کے لئے خصوصی اقدام کیے اور لائبریری کے ذمہ دار کے خلاف تادیبی کاروائی کا حکم دیا ۳۶۔ مزید براں جہانگیر کی اہلیہ نورجہاں کو کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا ان کا بھی اپنا ایک ذاتی کتب خانہ تھا جو بعض مورخین کے بقول نہایت قیمتی کتابوں کا مخزن تھا ۳۷۔ ان سب کے علاوہ مغل شہزادیوں میں زیب النساء کا کتب خانہ نہایت شاندار تھا، مختلف موضوعات (بالخصوص دینیات، فقہ، تاریخ وادب) پر بہترین کتابیں اس میں دستیاب تھیں۔ ''مآثر عالمگیری'' کے مولف کے بیان کے مطابق نادر کتابوں کے ایسے عظیم الشان مخزن کی نظیر ملنی مشکل تھی ۳۸۔ شہزادی نے اس کتب خانہ کی نگرانی کا باقاعدہ نظم قایم کیا تھا اور یہ ذمہ داری ملا محمد شفیع الدین کے سپرد کی تھی ۳۹۔ شہزادی کے علاوہ خاص طور سے وہ اصحاب قلم اس سے مستفید ہوتے تھے جو مختلف موضوعات پر کتابوں کی تالیف کے لئے مامور تھے۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اصحاب علم کی سرپرستی، اہل قلم کی حوصلہ افزائی اور علماء وفضلاء پر انعام واکرام سے علمی فضا پروان چڑھتی ہے۔ عہد مغلیہ کی بعض شہزادیوں اور خواتینِ حرم نے اس پہلو سے بھی علم کی اشاعت میں حصہ لیا۔ عبدالرحیم خانخاناں کی صاحبزادی وشہزادہ دانیال کی اہلیہ جاناں بیگم کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ وہ علماء وفضلاء کی بہت قدرداں تھیں اور ان پر داد ودہش میں بڑی فیاض واقع ہوئی تھیں ۴۰۔ نورجہاں بیگم عہدِ جہانگیری میں درباری سیاست میں سرگرمی دکھانے کے لئے بہت مشہور ہیں۔ لیکن ان کی علمی دلچسپی، شعری ذوق اور علم پروری کا ذکر کم ہی آتا ہے۔ وہ میدان شاعری میں بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی کے لئے معروف تھیں اور خاص بات یہ

Marfat.com

ہے کہ وہ شعراء کی سرپرستی وحوصلہ افزائی کرتی تھیں، ان میں مرد وعورت دونوں شامل تھے، معاصر نوجوان شاعر قاسم خاں کا شاعرانہ ذوق انہی کی رہنمائی میں پروان چڑھا، اسی طرح شاعر مہری ہروی نے انہی کی تربیت میں میدان شاعری سر کیا۔ مزید براں نور جہاں اچھے وبرمحل شعر پر شعراء کو انعام سے نوازتی تھیں ۴۱۔ شاہجہاں کی صاحبزادیوں میں جہاں آراء خود تعلیم سے آراستہ اور اہل علم وفن کی قدرداں تھیں، وہ علماء وفضلاء کو عطایا ووظائف سے نوازتی رہتی تھیں ۴۲۔ شعراء پر داد ودہش میں بھی بڑی فراخ دل تھیں، مثال کے طور پر عہد شاہجہانی کے معروف شعراء میں مرزا احسن بیگ قزوینی نے شاہجہاں آباد پر ایک مثنوی لکھی۔ اس میں اس شہر کے ایک باغ کی تعریف میں جو اشعار تھے جہاں آراء کو بہت پسند آئے، انھوں نے شاعر کو بطور انعام پانچ سو روپے بھجوائے ۴۳۔ ممتاز محل کی پرکشش شخصیت کا ایک پہلو رفاہی امور میں دلچسپی بالخصوص طالبات کی اعانت اور اہل علم پر انعام واکرام تھا۔ وہ غریب خاندان کی لڑکیوں کو وظائف اور اصحاب علم وفضل کو عطایا مرحمت کرنے میں کثیر رقوم صرف کرتی تھیں، ان امور کی نگرانی کے لئے انھوں نے ایک تعلیم یافتہ وتجربہ کار خاتون ستی النساء کو ''ناظرہ'' مقرر کیا تھا اور انھیں کی سفارش پر وہ مستحقین کو وظائف وعطایا سے نوازتی تھیں ۴۴۔ علم دوست شہزادی زیب النساء نے تو باقاعدہ دارالترجمہ والتصنیف قائم کر رکھا تھا، علامہ شبلی کے بقول ''زیب النساء کا دربار حقیقت میں ایک اکاڈیمی (بیت العلوم) تھی۔ ہرفن کے علماء وفضلاء نوکر تھے جو ہمیشہ تصنیف وتالیف میں مصروف رہتے تھے'' ۴۵۔ اس اکیڈمی سے جو علماء وفضلاء منسلک تھے انھیں شہزادی کی سرپرستی حاصل تھی، اس کے علاوہ ان کے مطالعہ وتحقیق میں آسانی کے لئے اپنے کتب خانہ کی صورت میں کتابوں کا بہترین ذخیرہ فراہم کیا تھا۔ وہ اس کی مدد سے ان کی پسند کے مطابق کتابوں کے ترجمہ یا تالیف کی خدمت انجام دیتے تھے۔ درحقیقت علماء، شعراء، مصنفین وخوش نویسوں کو انعام واکرام سے نوازنا شہزادی کے معمولات میں سے تھا معاصر وغیر معاصر متعدد تاریخی مآخذ وتذکروں میں اس کی تفصیلات ملتی ہیں ۴۶۔

Marfat.com

اورنگزیب کی ایک اور صاحبزادی زینت النساء علوم دینیہ سے واقفیت، اہل علم کی قدر دانی و حوصلہ افزائی کے لئے معروف تھیں جیسا کہ مؤرخین کے بیانات سے واضح ہوتا ہے ۴۷۔

معروضات بالا سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ عہد اسلامی کے ہندوستان میں نہ صرف یہ کہ عورتوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی جاتی تھی اور انھیں اپنی صلاحیتوں کو ترقی دینے کے مواقع فراہم تھے بلکہ تعلیم کی ترویج، علم کی اشاعت اور رفاہ عامہ کے کاموں میں شرکت کی پوری اجازت حاصل تھی اور انھوں نے اس سے فائدہ بھی اٹھایا۔ اوپر کے مباحث سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اس دور کی متعدد خواتین نے علم کی اشاعت کے تمام معروف ذرائع (مدارس کا قیام، اہل علم کی سرپرستی، طلبہ و معلمین کی مالی اعانت، کتب خانہ کا قیام، ترجمہ و تصنیف کی سہولیات کی فراہمی اور ذاتی طور پر تصنیفی و تالیفی کاموں میں انہماک) اختیار کیے اور اس طرح علمی فضا کو پروان چڑھانے کی کافی کوشش کی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس باب میں ہماری معلومات ابھی ناکافی ہیں اور صرف بادشاہ و امراء کے گھرانہ کی خواتین تک محدود ہیں لیکن مزید جستجو و تحقیق سے اس نہج پر مطالعہ کو اور وسعت و جامعیت دی جاسکتی ہے اور زیر بحث موضوع کے بہت سے پوشیدہ گوشوں کو سامنے لایا جاسکتا ہے۔ اللہ کرے آئندہ ہمیں اس کی توفیق نصیب ہو۔

☆☆☆

حواشی و مراجع

۱۔ شرقی سلطنت سے متعلق تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیں: اقبال احمد، تاریخ شیراز ہند جونپور، شیراز ہند پبلشنگ ہاؤس، جونپور، ۱۹۶۳ء، ص ۸۳۔ ۱۹۳؛ Mian Muhammad Saeed. *The Sharqi Sultanate of Jaunpur.* Karachi, 1972

Marfat.com

۲۔ خیر الدین الہ آبادی، تاریخ جونپور، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) عبدالسلام کلکشن نمبر ۵۳۸/۵۹، اوراق ۳۶ ب۔ ۳۷ الف تاریخ شیراز ہند جونپور، محولہ بالا، ص ۱۴۵۔۱۴۶، شرقی سلطنت آف جونپور، محولہ بالا، ص ۱۳۷

۳۔ شرقی سلطنت آف جونپور، ص ۱۳۷، (بحوالہ محمد امین زبیری، مسلم خواتین کی تعلیم، کراچی، ۱۹۵۶ء، ص ۳۶)

۴۔ اکبر نامہ، ۲/ ۵۵، ۱۰۰، ۱۵۵، ۱۵۷

۵۔ سرسید احمد خاں، آثار الصنادید، ۱/ ۳۳۸، بزم تیموریہ، ۳/ ۲۴۲۔۲۴۳

۶۔ آثار الصنادید، ۱/ ۳۳۸، ۳/ ۱۷۳

۷۔ اکبر نامہ، ۲/ ۲۰۱، منتخب التواریخ، ۲/ ۶۲

۸۔ این۔ این۔ لا، محولہ بالا، ص ۱۶۵۔۱۶۶، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص ۹۷۔۹۹، ۱۳۷

۹۔ کبیر کوثر، محولہ بالا، ص ۱۹۳

۱۰۔ زینت کوثر، ص ۱۵۳، ایس۔ بیوریج نے ہمایوں نامہ کے انگریزی ترجمہ کے ضمیمہ (ص ۲۱۸۔۲۲۰) میں بیگا بیگم کے حالات بہت تفصیل سے لکھے ہیں اور ہمایوں کے مقبرہ کی تعمیر کا بھی ذکر کیا ہے لیکن اس سے متصل بیگا بیگم کے قائم کردہ مدرسہ کا حوالہ نہیں ملتا۔

۱۱۔ زینت کوثر، ص ۱۵۶

۱۲۔ ہندوستان اسلامی عہد میں، ص ۱۲۳، ۱۵۰، ۱۶۲، آثار الصنادید، ۱/ ۳۴۹

۱۳۔ ہندوستان اسلامی عہد میں، ص ۱۶۲، سید عبدالحی الحسنی، نزھۃ الخواطر، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۵۹ء، ۷/ ۲۹۵، آثار الصنادید، ۲/ ۸۵۔۸۶

۱۴۔ ہندوستان اسلامی عہد میں، ص ۱۴۴۔۱۴۵، ۱۶۲

۱۵۔ آثار الصنادید، ۲/ ۳۴۸۔۳۴۹

۱۶۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص ۳۲۔۳۳، زینت کوثر، ص ۱۶۰۔

Yusuf Husain khan ,"The Educational System in Medieval India," *Islamic Culture*,30/2, April, 1956,P.117.

Marfat.com

۱۷ مرزا نظام الدین احمد، حدیقۃ السلاطین قطب شاہی، ادارہ ادبیات اُردو، حیدرآباد ۱۹۶۱ء، ص ۱۲۳ ۔ ۱۲۴، عبدالمجید صدیقی، تاریخ گولکنڈہ، ادارہ ادبیات اُردو، حیدرآباد، ۱۹۶۴ء، ص ۴۲۴ ۔ ۴۲۵، ہندوستان اسلامی عہد میں، ص ۱۶۴

۱۸ نزھۃ الخواطر، ۲۲۱/۶، ہندوستان اسلامی عہد میں، ص ۱۶۴

۱۹ مقالات شبلی (مرتبہ سید سلیمان ندوی) جلد چہارم (مقالہ: ہمایوں نامہ)، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۵۶ء، ص ۵۶

۲۰ مقالات شبلی، ۴/ ۵۹

۲۱ نزھۃ الخواطر، ۱۲۲/۵ ۔ ۱۲۳، بزم تیموریہ، ۲۴۳/۳، اسلامی نظام تعلیم ۔ ص ۲۴۴ ۔ ۲۴۵

A.M.A. Shushtery, *Outlines of Islamic Culture* Banglore 1954.P 589

Zafarul Islam, "Contribution to Quranic Science of Tafsir during the reign of Akbar (1556-1605)" *Hamdard Islamicus*, 12/2, Summer, 1988,pp. 39-55 (کسی معاصر ماخذ میں تفسیر جاناں بیگم کا ذکر نہ مل سکا)

۲۲ بزم تیموریہ، ۲۴۳:۳

۲۳ جہاں آرا بیگم، مونس الارواح (مع تذکرہ و تبصرہ از پروین کاظمی)، شاہ ابوالخیر اکیڈمی، دہلی، ۱۹۷۰ء، ص ۲۲، ۸۴، بزم تیموریہ، ۳/ ۲۴۹ ۔ ۲۵۰

۲۴ الندوہ (لکھنؤ)، ۴/۸، اپریل ۱۹۱۱ء/ ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ، شذرات، ص ۳۲ (الندوہ کی متعلقہ عبارت کی نقل کی فراہمی کے لئے میں گرامی قدر مولانا ضیاء الدین اصلاحی ناظم دارالمصنفین کا بے حد ممنون ہوں۔)

۲۵ اس رسالہ کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ فرمائیں: محمد ابراہیم، ''جہاں آرا بیگم کی ایک غیر معروف تصنیف ۔ صاحبیہ''، اورینٹل کالج میگزین (لاہور)، ۴/۱۳، اگست، ۱۹۳۷ء ص ۳ ۔ ۱۹

۲۶ مونس الارواح، ص ۱۷ ۔ ۲۱، اسلامی نظام تعلیم، ص ۲۳۹ ۔ ۲۴۰

۲۷ بزم تیموریہ، ۳/ ۲۵۷

Marfat.com

۲۸ مآثر عالمگیری،ص ۵۳۹، نزہۃ الخواطر، ۶/۹۳

۲۹ ED. Sachau/ H.Ethe. *Catalogue of the Persian, Turkish, Hindustani and Pushtu Manuscripts in the Bodleian Library* Oxford, 1889,1/1044

۳۰ انیس الحجاج پر تفصیلی معلومات کے لئے ملاحظہ فرمائیں: شاہ معین الدین ندوی، ''انیس الحجاج'' معارف، ۹۳/۱، جنوری ۱۹۶۴ء، ص ۵۔۲۴

۳۱ مقالات شبلی، ۵/۱۰۵، بزم تیموریہ، ۳/ ۲۵۷۔۲۵۸

۳۲ اس دیوان پر مفصل بحث کے لئے ملاحظہ فرمائیں: بزم تیموریہ، ۳/ ۲۶۱۔۲۶۳

۳۳ تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیں: Abdul Aziz, *The Imperial Library of the Mughals*, Idara Adabiyat -i-'Delli, Delhi.1974.

۳۴ بایزید بیات، تذکرہ ہمایوں واکبر، کلکتہ، ۱۹۴۱ء، ص ۳۷۷، ہمایوں نامہ (انگریزی ترجمہ) محولہ بالا، ص ۷۶ (مقدمہ) این۔این۔لا، ص ۲۰۱۔۲۰۲، زینت کوثر، ص ۱۵۳

۳۵ تذکرہ ہمایوں واکبر، ص ۳۷۷

۳۶ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، ۲/ ۳۷

۳۷ عبدالحمید لاہوری، بادشاہ نامہ، ۲/ ۴۷۵، مآثر الامراء، جلد دوم، حصہ دوم، ص ۱۰۷۹ زینت کوثر، ص ۱۵۷

۳۸ مآثر عالمگیری، ص ۵۳۹، نیز دیکھئے مقالات شبلی، ۴/ ۱۰۶، شرف النساء، ص ۲۳۹، زینت کوثر، ص ۱۶۲۔۱۶۳

۳۹ اسلامی نظام تعلیم، ص ۲۴۳

۴۰ بزم تیموریہ ، ۳/۲۴۳

۴۱ شیر خاں لودی، مرآۃ الخیال، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، یونیورسٹی ضمیمہ نمبر ۱۶، اوراق ۶۴ ب۔ ۶۵ الف، بزم تیموریہ، ۳/ ۲۴۷۔۲۴۸

۴۲ این۔این۔لا، ص ۲۰۳، زینت کوثر، ص ۱۵۹، Muhammad Azhar Ansari

Marfat.com

" The Haram of the Great Mughals" , Islamic Culture.

34/2, April,1960,P.119

۴۳ کلمات الشعراء، ورق ۱۳۵ الف، اسلامی نظام تعلیم ص ۲۴۰

۴۴ بادشاہ نامہ ۲/ ۶۲۹، مآثر الامراء ۱/ ۷۹۰۔۷۹۱، زینت کوثر ص ۱۵۸

۴۵ مقالات شبلی، ۵/ ۱۰۵

۴۶ مآثر عالمگیری، ص ۵۳۹، بختاور خاں، مرآۃ العالم، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، عبدالسلام کلکشن، نمبر ۳۱۴/ ۸۴ ورق ۲۱۳ الف، غلام علی آزاد بلگرامی، ید بیضا مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، احسن کلکشن، نمبر ۹۲۰/ ۷، فارسیہ تذکرہ، ورق ۱۱۰ الف، مقالات شبلی، ۵/ ۱۰۷۔۱۰۸، این۔ این لا ص ۲۰۴، بزم تیموریہ، ۳/ ۲۶۰۔۲۶۱

۴۷ مآثر عالمگیری ص ۵۳۹، مرآۃ العالم، ورق ۲۱۳ ب، زینت کوثر ص ۱۶۴

Marfat.com

کتابیات

عربی کتب:

ابن بطوطہ — **رحلہ ابن بطوطہ**، دارصادر، بیروت، ۱۹۶۴ء

احمد بن علی القلقشندی — **صبح الاعشی**، الجزء الخامس، القاہرہ، ۱۹۱۵ء

شہاب الدین العمری — **مسالک الابصار** (عربی متن مع اردو ترجمہ خورشید احمد فارق بعنوان تاریخ ہند پر نئی روشنی عربی کی ایک قلمی کتاب سے) ندوۃ المصنفین، دہلی (بدون تاریخ)

عالم بن العلاء الحنفی — **الفتاوی التاتارخانیہ** (تصحیح وتدوین: قاضی سجاد حسین) الجزء الاول، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۸۴ء

عبدالحیٔ الحسنی — **الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند**، المجمع العلمی العربی، دمشق، ۱۹۵۸ء

عبدالحیٔ الحسنی — **نزھۃ الخواطر** (۸جلدیں) دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد ۱۹۴۷-۱۹۵۹ء، ۱۹۷۰ء

عمر رضا کحالہ — **اعلام النساء** (۱۵اجزاء) موسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۹۹۱ء

غلام علی آزاد بلگرامی — **سبحۃ المرجان** (تحقیق وتدوین: ڈاکٹر فضل الرحمن ندوی)، ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۷۶ء

محمد بن اسمٰعیل البخاری — **الجامع الصحیح للبخاری** (۱۹اجزاء) مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۳۴۵ھ

محمد حسین الذہبی — **التفسیروالمفسرون**، دارالکتب الحدیثہ، القاہرہ، ۱۹۶۲ء

فارسی کتب:

ابوالفضل — **آئینِ اکبری** (تصحیح سرسید احمد خاں)، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء

ابوالفضل — **اکبرنامہ** (تین جلدیں) ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ، ۱۸۷۳ - ۱۸۸۷ء

امیر حسن سجزی (مرتب) — **فوائد الفواد**، ملک سراج الدین اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۶۶ء

بایزید بیات — **تذکرہ ہمایوں واکبر**، کلکتہ، ۱۹۴۱ء

بختاور خاں — **مرأۃ العالم** مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، عبدالسلام کلکشن، فارسیہ، اخبار مغل، نمبر ۸۴/۳۱۴

بدرالدین چاچی — **قصائد بدر چاچ**، نول کشور، کانپور، ۱۸۷۷ء

بشیر الدین احمد (مرتب) — **فرامین سلاطین**، دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، ۱۹۲۶ء

جہاں آرا — **مونس الارواح** (مع تذکرہ وتبصرہ از پروین کاظمی)، شاہ ابوالخیر اکیڈمی) دہلی، ۱۹۷۰ء

حسن نظامی — **تاج المآثر** نقل نمبر ۹۵ (مخطوطہ انڈیا آفس) ریسرچ لائبریری شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

حمید قلندر (مرتب) — **خیرالمجالس** (تصحیح پروفیسر خلیق احمد نظامی) علی گڑھ (بدون تاریخ)

خواند میر — **قانون ہمایونی**، کلکتہ، ۱۹۴۰ء

خیر الدین الہ آبادی — **تاریخ جونپور**، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، عبدالسلام کلکشن، نمبر ۵۹/۵۳۸

رحمان علی خاں — **تذکرہ علماء ہند**، نول کشور، ۱۹۱۴ء

رزق اللہ مشتاقی — **واقعات مشتاقی**، روٹوگراف نمبر ۳ (مخطوطہ برٹش میوزیم، لندن) ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ساقی مستعد خاں — **مآثر عالمگیری**، کلکتہ، ۱۸۷۱ء

سجاد حسین (مرتب) — **سراج الہدایہ** (ملفوظات سید جلال بخاری مخدوم جہانیاں)، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء

سجان رائے بھنڈاری — **خلاصۃ التواریخ**، دہلی، ۱۹۱۸ء

——— — **سیرت فیروز شاہی** نقل (مخطوطہ خدا بخش لائبریری، پٹنہ) مولانا آزاد لائبریری، یونیورسٹی کلکشن نمبر ۱۱۱

Marfat.com

شاہنواز خاں	مآثر الامراء (تین جلدیں)، کلکتہ، ۱۸۸۸ء۔ ۱۸۹۱ء
شمس سراج عفیف	تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۹۱ء
شیر خاں لودی	مرأۃ الخیال مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، یونیورسٹی ضمیمہ نمبر ۱۶
ضیاء الدین برنی	تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۶۰ء
ظہیر الدین بابر	بابر نامہ، چترا پربھا پریس، بمبئی، ۱۳۰۸ھ
عبدالباقی نہاوندی	مآثر رحیمی، کلکتہ، ۱۹۲۴ء
عبدالحق محدث دہلوی	اخبار الاخیار، مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۳۳۲ھ
عبدالحمید لاہوری	بادشاہ نامہ، (جلد دوم) کلکتہ، ۱۸۶۸ء
عبدالقادر بدایونی	منتخب التواریخ، کلکتہ، ۱۸۶۸ھ
عبداللہ داؤدی	تاریخ داؤدی (تصحیح پروفیسر عبدالرشید) علی گڑھ (بدون تاریخ)
عزالدین عصامی	فتوح السلاطین، مدراس ۱۹۴۸ء
غلام علی آزاد بلگرامی	مآثر الکرام، مفید عام پریس، آگرہ، ۱۹۱۰ء
غلام علی آزاد بلگرامی	ید بیضاء، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، ذخیرہ احسن نمبر ۹۲۰/۷
———	فتوحات فیروز شاہی (تصحیح پروفیسر عبدالرشید) علی گڑھ ۱۹۵۴ء
فخر مدبر	تاریخ فخر الدین مبارک شاہ (بہ تصحیح ای ڈینی سن راس)، لندن، ۱۹۲۷ء
محمد افضل سرخوش	کلمات الشعراء، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، یونیورسٹی کلکشن، فارسیہ، اخبار، نمبر ۱۵۰
محمد صالح کنبولاہوری	عمل صالح، کلکتہ، ۱۹۳۹ء
محمد قاسم فرشتہ	تاریخ فرشتہ، نول کشور (بدون تاریخ)
محمد کاظم	عالمگیر نامہ، کلکتہ، ۱۸۶۸ء
مرزا نظام الدین	حدیقۃ السلاطین قطب شاہی، ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد، ۱۹۶۱ء
منہاج السراج	طبقات ناصری، کالج پریس، کلکتہ، ۱۸۶۴ء
میر خورد کرمانی	سیر الاولیاء، موسس انتشارات اسلامی، لاہور، ۱۹۷۸ء
ناصر ہیری (مرتب)	دیوان سعد مسعود سلمان، چاپخانہ فراین ایران خرداد، ۱۳۶۲ء

نظام الدین احمد بخشی — طبقات اکبری، کلکتہ، ۱۹۱۱ء

ولی اللہ انصاری — اغصان الاربعہ للشجرۃ الطیبہ، مطبع کارنامہ لکھنؤ، ۱۸۸۱ء

یحییٰ بن احمد سرہندی — تاریخ مبارک شاہی، کلکتہ، ۱۹۳۱ء

یوسف میرک — مظہر شاہجہانی، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد (سندھ)، ۱۹۶۲ء

اردو کتب:

ابوالحسنات ندوی — ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۷۱ء

ابوظفر ندوی — تاریخ سندھ، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۷۰ء

اشفاق احمد — ملاجیون کے معاصر علماء، نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۲ء

اقبال احمد — تاریخ شیراز ہند جونپور، شیراز پبلشنگ ہاؤس، جونپور ۱۹۶۳ء

الطاف احمد اعظمی — تاریخ طب واطباء دور مغلیہ، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی ۱۹۹۲ء

ایڈورڈ سی سخاؤ/ — البیرونی کا ہندوستان، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء
اردو ترجمہ: عبدالحی/مقدمہ
وحواشی: قیام الدین احمد

ایس ایم جعفر/مترجم: — تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں
سعید انصاری — (اردو ترجمہ: Education in Medieval India)
ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء

خلیق احمد نظامی — تاریخ مشائخ چشت (جلد اول) ادارہ ادبیات دلی، دہلی، ۱۹۸۰ء

خلیق احمد نظامی — سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۸۱ء

—— — دینی مدارس اور ان کے مسائل (مقالات سیمینار)، ادارہ علمیہ، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج (اعظم گڈھ)، ۱۹۹۰ء

ریاست علی ندوی — عہد اسلامی کا ہندوستان، ادارۃ المصنفین پٹنہ، ۱۹۵۰ء

سرسید احمد خاں — آثار الصنادید، سنٹرل بک ڈپو، دہلی، ۱۹۶۵ء، جدید ایڈیشن (تین جلدیں مرتبہ خلیق انجم) اردو اکادمی دلی، نئی دہلی ۱۹۹۰ء

سعید احمد رفیق — اسلامی نظام تعلیم، ادارہ تصنیف وتالیف، آل پاکستان ایجوکیشنل

Marfat.com

کانفرنس، کراچی (بدون تاریخ)
سعید انصاری سیر الصحابیات، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۵۲ء
سید سلیمان ندوی مقالات سلیمان، (دوجلدیں) مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۶۸ء
سید سلیمان ندوی سیرت عائشہ، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۶۸ء
شاہ ولی اللہ دہلوی / مترجم: انفاس العارفین، مکتبہ الفلاح، دیوبند، (بدون تاریخ) ۱۹۸۷ء
سید محمد الفاروق القادری
شبلی نعمانی مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، قومی پریس، لکھنؤ، ۱۸۸۸ء
شبلی نعمانی مقالات شبلی (مرتبہ سید سلیمان ندوی) جلد دوم، سوم، چہارم و پنجم، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۵۵ء، ۱۹۵۵ء، ۱۹۵۷ء، ۱۹۳۶ء (بالترتیب)
صباح الدین عبدالرحمن بزم تیموریہ (تین جلدیں)، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۷۴ء، ۱۹۸۴ء، ۱۹۸۷ء
ضیاء الحسن فاروقی مسلمانوں کا تعلیمی نظام، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء
ظفر الاسلام اصلاحی اسلامی قوانین کی ترویج وتنفیذ۔ عہد فیروز شاہی کے ہندوستان میں ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء
ظہیر الدین بابر / مترجم: تزک بابری، سنگ میل پبلیکشنز، لاہور، ۱۹۶۹ء
رشید اختر ندوی
عبدالحئی الحسنی / مترجم: اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں (اُردو ترجمہ: **الثقافه الاسلامیه فی الهند**)، دارالمصنفین، اعظم گڈھ، ۱۹۶۹ء
ابوالعرفان ندوی
عبدالحئی الحسنی / مترجم: ہندوستان اسلامی عہد میں (کا اُردو ترجمہ: **جنة المشرق ومطلع النور المشرق**) مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، ۱۹۷۳ء
شمس تبریز خاں
عبدالسلام ندوی اسوہ صحابیات، مطبع معارف، اعظم گڈھ، ۱۹۳۶ء
عبدالمجید سالک مسلم ثقافت ہندوستان میں، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور (بدون تاریخ)
عبدالمجید صدیقی تاریخ گولکنڈہ، ادارہ ادبیات اُردو، حیدرآباد، ۱۹۶۴ء

Marfat.com

عنایت عارف — شرف النساء، مکتبہ علمیہ، لاہور، ۱۹۵۹ء

قاری محمد طاہر — پاکستان میں علم تجوید وقرات، ماضی، حال، مستقبل (غیر مطبوعہ پی۔ایچ۔ڈی مقالہ) ادارہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۹۷ء

قاضی اطہر مبارک پوری — خیر القرون کی درسگاہیں اور انکا نظام تعلیم وتربیت، شیخ الہند اکیڈمی، دار العلوم، دیوبند، ۱۹۹۵ء

قاضی اطہر مبارکپوری — ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۷ء

گلبدن بیگم/مترجم: عثمان حیدر مرزا — ہمایوں نامہ، مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۳۵ء

مجیب اللہ ندوی — فتاوای عالمگیری اور اس کے مولفین، تاج کمپنی، دہلی، (بدون تاریخ)

محمد اسحاق/اردو ترجمہ: شاہد حسین رزاقی — علم حدیث میں برعظیم پاک وہند کا حصہ، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۳ء

محمد اسحاق بھٹی — فقہائے ہند'' جلد اول'' ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۴ء

محمد قمر اشتیاق — ہندوستان کے اہم مدارس۔ایک سروے، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء

محمد اسلم جیراجپوری (مرتب) — خواتین، سنگم کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۱ء

محمد رحیم بخش — حیات ولی، المکتبہ السلفیہ، لاہور، ۱۹۵۵ء

محمد رضا انصاری فرنگی محل — بانیِ درس نظامی ملا نظام الدین محمد، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۷۳ء

محمد عمر — اٹھارہویں صدی عیسویں میں ہندوستانی معاشرت، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۳ء

محمد غوثی شطاری/مترجم فضل احمد — گلزار ابرار، لاہور، ۱۳۹۵ھ

مناظر احسن گیلانی — ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت (دو جلدیں) ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۴۴ء

Marfat.com

مضامین (اُردو):

اقتدار حسین صدیقی ''عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں تاریخ نگاری (تیرھویں صدی عیسوی کے مسلم مورخین کی تالیفات کا تجزیاتی مطالعہ)'' تحقیقات اسلامی (علی گڑھ) ۸/۱، جنوری۔ مارچ، ۱۹۸۹ء ص ۶۱۔۷۳

شاہ معین الدین ندوی '' انیس الحجاج، '' معارف (اعظم گڈھ)، ۹۳/۱ جنوری، ۱۹۶۴ء ص ۵۔۲۴

شبیر احمد خاں غوری ''اسلامی ہند کے نصف اول میں علوم عقلیہ کا رواج '' معارف ۹۱/۴، ۵، اپریل مئی، ۱۹۶۳ء، ص ۲۴۵۔۲۵۷، ۳۲۵۔۳۳۹

حبیب الرحمٰن خاں شروانی ''قصائد مطہر کڑہ'' معارف، ۳۶/۱، جولائی، ۱۹۳۵ء ص ۴۲۔۴۷

ریاست علی ندوی ''کچھ فتاوائے تاتارخانی کے بارے میں''، معارف، ۵۹/۳، مارچ، ۱۹۴۷ء، ص ۱۶۵۔۱۸۰

ضیاء الدین اصلاحی ''اسلام اور تعلیم نسواں''، معارف، ۱۷۷/۴، ۵، اپریل مئی ۲۰۰۶ء، ص ۲۷۵۔۲۹۳، ۳۴۵۔۳۶۳

ظفر الاسلام اصلاحی ''برصغیر میں علم قراءت کا ارتقاء'' فکر و نظر (اسلام آباد)، ۳۶/۱، جولائی۔ ستمبر، ۱۹۹۸ء، ص ۴۷۔۶۷

محمد ابراہیم ''جہاں آراء بیگم کی ایک غیر معروف تصنیف۔ صاحبیہ'' اورینٹل کالج میگزین (لاہور) ۱۳/۴، اگست، ۱۹۳۷ء ص ۳۔۱۹

محمد حمید اللہ ''عہد نبوی کا نظام تعلیم'' نقوش (لاہور) رسول نمبر، ۱۹۸۳ء، ۴/۱۱۵۔۱۲۷

محمد شفیع ''مطہر کڑہ''، اورینٹل کالج میگزین ۱۱/۳، مئی، ۱۹۳۵ء، ص ۱۰۷۔۱۱۶

(مدیر التجوید) ''قاری احمد میاں تھانوی۔ انٹرویو'' التجوید (فیصل آباد، پاکستان)، شمارہ نمبر ۹۸، جنوری۔ فروری، ۲۰۰۶ء، ص ۷۔۱۹

وحید مرزا ''دیوان مطہر کڑہ''، اورینٹل کالج میگزین، ۱۱/۳، مئی ۱۹۳۵ء، ص ۱۱۶۔۱۵۱

Marfat.com

English books:

Abdul Aziz	*The Imperial Library of the Mughals*, Delhi, 1974.
Archana Chaturvedi (ed.)	*Encyclopaedia of Muslim Women* (5 vols.), Commonwealth Publishers, New Delhi, 2003.
A.M. Shushtery	*Outlines of Islamic Culture*, Banglore, 1954.
Babur/ Eng. Tr.: A.S. Beveridge	*Babur Nāma*, Orient Book Print, Delhi, 1970.
B.P. Saxena	*History of Shah Jahan*, Allahabad, 1973.
F. Bernier	Travels in the Mogul Empire (1656-1668) (Eng. Tr.: A. Constable), Oxford University Press, London, 1934.
G.D.M. Sufi	*Al-Minhāj* (The Evolution of Curriculum), Delhi, 1977.
Gulbadan Begum/ Eng. Tr.: A.S. Beveridge	*The History of Humayun* (*Humayun Nāma*) (with Persian text), New Delhi, 1972.
Ishtiaq Husain Qureshi	*The Administration of the Mughal Empire*, N.V. Publications, Delhi (n.d.)
Jafar Sharif/ Eng. Tr.: G.A. Herklots	*Qanun-I-Islam The Customs of Musalmans of India*, (Revised by William Crooke), New Delhi, 1972.
J.M. Banerjee	*History of Firuz Shah Tughluq*, Delhi, 1997.
Kabir Kausar/ Inamul Kabir	*Biographical Dictionary of Prominent Muslim Ladies*, New Delhi, 1982.
Khaliq Ahmad Nizami	*Some Aspects of Religion and Politics in India During the Thirteenth Century*, Delhi, 1974.

Khaliq Ahmad Nizami	*Studies in Medieval Indian History and Culture,* Allahabad, 1966.
Krishnalal Ray	*Education in Medieval India,* Delhi, 1984.
Mian Muhammad Saeed	*The Sharqi Sultanate of Jaunpur,* Karachi, 1972.
Minhaj al-Siraj/ Eng. Tr.: M.H.G. Raverty	*Tabakāt-i-Nasiri* (Eng. Tr. of *Tabaqāt-i Nasiri*), New Delhi, 1970.
Muhammd Nazim	*The Life and Times of Sultan Mahmud of Ghazna,* New Delhi, 1971.
Narendra Nath Law	*Promotion of Learning in India during Muhammadan Rule,* Delhi, 1973.
Rafat M. Bilgrami	*Religious and Quasi – Religious Departments of the Mughal Period,* New Delhi, 1994.
Rumer Godden	*Gulbadan* (Portrait of a Rose Princess at the Mughal Court), The Viking Press, New York, 1980.
Shahabuddin al-Umari/ Eng. Tr.: Otto Spies	*Masālik al-Absār,* Aligarh, 1943.
V.A. Smith	*Akbar the Great Moghul,* Oxford, 1919.
W.H. Moreland	*From Akbar to Aurangzeb,* London, 1923.
Yusuf Husain	*Glimpses of Medieval Indian Culture,* Bombay, 1959
Zinat Kausar	*Muslim Women in Medieval India,* Janaki Prakashan, New Delhi, 1992.
Ziauddin Desai	*Centres of Islamic Learning in India,* New Delhi, 1978.

Marfat.com

English Articles:

Iqtidar Husain Siddiqui — "Islamic Learning and Intellectual Thought of the Sultanate of Delhi during the Lodi Period", *Hamdard Islamicus* (Karachi) 10/3, Autumn, 1987, pp.57-83.

Iqtidar Husain Siddiqui — "Science and Scientific Instruments in the Sultanate of Delhi", *Hamdard Islamicus*, 18/3, Autumn, 1994, pp.5-18.

Muhammad Azhar Ansari — "The Haram of the Great Mughals", *Islamic Culture* (Hyderabad) 34/ I & II, Jan & April, 1960, pp. 1-13, 106-124.

Yusuf Husain Khan — "The Educational System in Medieval India", *Islamic Culture*, 30/2, April, 1956, pp.106-125.

Zafarul Islam — "Contribution to Quranic Science of *Tafsir* during the reign of Akbar (1556-1605)," *Hamdard Islamicus*, 12/2, Summer, 1988, pp.39-55.

Marfat.com